اسلام اور بیمہ (انشورنس)

ہمارا عقیدہ ہے کہ اسلام نوع انسانی کے لئے وہ آخری پیغام حیات ہے جو قیامت تک آنے والی نسلوں کو زندگی کے تمام شعبوں میں رہنمائی کے لئے ہر زمانہ اور ہر ماحول میں کافی وافی ہے، اب خدائی ہدایت اور تشریع الٰہی کا مستند ماخذ صرف اسلام ہے۔ آئندہ کوئی مزید ہدایت اور تشریع آنے والی نہیں ہے جس کی طرف انسان کو رجوع کرنے کی ضرورت ہو۔ اسی ہدایت ربانی میں ہماری مادی، روحانی، شخصی، اجتماعی، اقتصادی، معاشی، سیاسی، غرض ہر ضرورت کا سامان موجود ہے۔

قرآن کریم نے اس ہدایت ربانی کے اصول وکلیات کی طرف رہنمائی کی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وعمل اور تقریر (بیان سکوتی) سے ان اصول وکلیات کی تفصیلات اور جزئیات بیان فرمائیں۔ پھر چونکہ یہ آخری ہدایت ہے اس لئے امت محمدیہ کو اللہ تعالیٰ نے اجتہاد کے شرف سے نوازا، ائمہ مجتہدین نے اپنی مقدور بھر کوششیں اور عمریں قرآن کریم وحدیث نبوی کے سمجھنے اور ان ہر دو ماخذوں سے احکام اور ان کی علل وغایات استنباط کرنے میں اور غیر منصوص مسائل کے احکام ان سے اخذ کرنے میں صرف کیں، بالآخر ان برگزیدہ نفوس کی سعی وکوشش سے ایک عظیم ذخیرہ احکام وقوانین ظہور پذیر ہو گیا جس کو ''فقہ اسلامی'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

فقہ اسلامی میں ہمارے اس زمانہ کی بیشتر ضروریات کا حل موجود ہے، لیکن جدید تمدن اور صنعتی انقلاب نے اس زمانہ میں نت نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ معاملات، معاشیات، اور اقتصادیات کے سلسلہ میں سینکڑوں ایسے مسائل پیدا ہو گئے ہیں جو حل طلب ہیں اور علماء امت کو دعوت فکر دے رہے ہیں کہ وہ ''فقہ اسلامی کی روشنی میں ان کا حل پیش کریں'' اصل میں یہ کام اسلامی حکومتوں کا تھا کہ وہ اپنے وسیع تر ذرائع ووسائل استعمال کر کے عالم اسلام کے منتخب اور مستند علماء کو جمع کرتیں اور ان کے ساتھ نئے معاملات ومسائل کے جاننے والے ماہرین موجود ہوتے، پھر یہ سب حضرات قرآن کریم، حدیث نبوی اور فقہ اسلامی کی روشنی میں ان جدید مسائل کے صحیح حل اور جوابات دیتے، اسی طرح منصوص احکام کی علتوں کو ٹھیک ٹھیک

سمجھ کران تمام جدید معاملات میں ان کو جاری کرتے جن میں وہ علتیں فی الواقع پائی جاتی ہیں۔

لیکن تاریخ کا یہ بھی ایک عجیب المیہ ہے کہ موجودہ مسلم حکومتوں پر ایسے افراد مسلّط ہیں جو اپنے وسائل وذرائع کو اسلام کے احیاء اور اس کی نشاۃ ثانیہ پر صرف کرنے کے بجائے اسلام کی ''تجدید'' پر خرچ کررہے ہیں، ان تمام تر کوششوں کا حاصل یہی ہے کہ عام مسلمانوں کو اسلام کی حقیقی تعلیمات واحکام سے برگشتہ کرکے الحاد اور ذہنی آوارگی کے حوالہ کردیا جائے اگر کسی حکومت کے زیر انصرام کوئی ایک آدھ ادارہ ''تحقیقات اسلامی'' کے نام سے نظر بھی آتا ہے تو وہ بھی صرف اس غرض کے لئے ہے کہ ''جدید اسلام'' کی داغ بیل ڈال کر صحیح اسلام کے نقوش مسلمانوں کے دلوں سے مٹادیئے جائیں۔ اس قسم کے اداروں کا مافی الضمیر سمجھنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ان کو غذا استشراق کے طعام خانوں سے ملتی ہے جن کا مقصد وحید یہی ہے کہ جو اسلام تلوار کے زور سے فتح نہیں ہوسکا اس کو تشکیک کی راہوں پر ڈال کر ختم کردیا جائے۔

دوسرے درجہ میں علماء امت کا فریضہ تھا کہ وہ ان پیش آنے والے مسائل کا حل پیش کرتے۔ اجتماعی طور پر نئے مسائل میں غور وفکر کرنا اسلام کی منشاء کے عین مطابق ہے اور سلف میں اس کی متعدد نظیریں موجود ہیں۔ امام ابوبکر الرازی الجصاصؒ اپنی بے نظیر کتاب ''احکام القرآن'' میں آیت کریمہ **لعلمه الذين يستنبطونه منهم** اور **وانزلنا اليک الذکر لتبين للناس مانزّل اليهم** کے تحت احکام شرعیہ میں غور وفکر کرنے کی اس طرح دعوت دیتے ہیں۔

> **فحثنا على التفكر فيه وحرّضنا على الاستنباط والتدبير وامرنا بالاعتبار لنتسابق الى ادراك احكامه وننال درجة المستنبطين والعلماء الناظرين.** (۱)
>
> ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے ہم کو غور وفکر کرنے پر آمادہ کیا ہے اور احکام معلوم کرنے اور ان سے قیاس سے کام لینے کا حکم دیا ہے تاکہ ہم اس کے احکام معلوم کرنے کی طرف پیش قدمی کریں اور احکام معلوم کرنے والے اور غور وفکر کرنے والے علماء میں شامل ہوجائیں۔

---

(۱) احکام القرآن للجصاص – ۲/ ۴۹.

فقیہ ملّت امام ابوحنیفہؒ غالباً ائمہ مجتہدین میں سب سے پہلے امام ہیں جنہوں نے ''مسائل وواقعات'' ...... میں غور وفکر کرنے کے اجتماعی طریقے کو فروغ دیا، امام ممدوح نے اپنے شاگردوں میں سے چند نامور شخص انتخاب کئے جن میں سے اکثر خاص فنوں میں جو تکمیل فقہ کے لئے ضروری تھے استاد زمانہ تسلیم کئے جاتے تھے مثلاً یحیٰ بن ابی زائدہ، حفص بن غیاث، قاضی ابو یوسف، داؤد الطائی، حبان، مندل حدیث وآثار میں نہایت کمال رکھتے تھے، امام زفر قوّت استنباط واستحسان میں مشہور تھے، قاسم بن معن اور امام محمد کو ادب اور عربیت میں کمال حاصل تھا۔ امام اعظمؒ نے ان حضرات کی شرکت میں ایک مجلس مرتب کی اور مسائل حاضرہ پر غور وفکر شروع کیا، امام طحاویؒ نے بسند متصل اسد بن فرات سے روایت کیا ہے کہ ابوحنیفہؒ کے تلامذہ جنہوں نے فقہ کی تدوین کی اور اس عظیم کام میں امام صاحب کے شریک رہے چالیس تھے۔ ۵۰۰ھ میں جب ''بیع بالوفا'' کا بخارا اور اس کے اطراف میں رواج شروع ہوا تو چونکہ یہ معاملہ کی ایک نئی صورت تھی (٭) بیع صحیح، بیع فاسد اور رہن کا مجموعہ نظر آتی تھی اس لئے اس زمانہ کے علماء کا اس کے جواز وعدم جواز میں اختلاف ہوا بعض نے اجازت دی، بعض نے ممانعت کی، امام ابوالحسن ماتریدی کو اس زمانہ کے ایک مشہور عالم نے مشورہ دیا کہ اس مسئلہ میں اختلاف رونما ہو گیا ہے۔ آپ اس معاملے کو رہن سمجھتے ہیں میرا بھی یہی خیال ہے مگر لوگ پریشان ہیں۔ آپ علماء امّت کو جمع کریں اور اس مسئلہ میں غور وفکر کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچ کر عوام کے سامنے ایک ''متفقہ فتویٰ'' پیش کریں تا کہ ان کا اضطراب وتردّد دور ہو۔ ''قاضی سماوہ'' نے ''جامع الفصولین'' میں نقل کیا ہے:

قلت للامام ابی الحسن الماتریدی قد فشی هذا البیع بین الناس وفیه مفسدة عظیمة وفتواک انه رهن وانا ایضاً علیٰ ذالک فالصواب ان تجمع الائمة وتتفق علی هذا وتظهره بین الناس (۱)

ترجمہ: ''میں نے امام ابوالحسن ماتریدی سے عرض کیا کہ بیع بالوفاء کا رواج عام ہو گیا ہے اور اس میں بڑی خرابی ہے آپ کا فتویٰ یہ ہے کہ یہ رہن کے حکم میں ہے میرا بھی یہی خیال ہے لہٰذا بہتر طریقہ یہ ہے کہ آپ علماء کبار کو جمع کریں اور ان کے اتفاق رائے سے متفقہ فیصلہ لوگوں کے سامنے ظاہر فرما دیں''۔

(۱) جامع الفصولین -الفصل الثامن عشر فی بیع الوفاء - ۱/ ۲۳۴ -ط: اسلامی کتب خانہ.

قابل مبارک باد ہیں ''دارالعلوم ندوۃ العلماء'' کے منتظمین کہ انہوں نے اس ملی ضرورت کومحسوس کیا اور ایک مجلس بنام ''مجلس تحقیقات شرعیہ'' تشکیل کی جس کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسائل جدیدہ میں علماء غور وفکر کریں اور متفقہ فیصلہ عوام کے سامنے پیش کریں، چنانچہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی ''بیمہ'' کے بارے میں ایک تفصیلی سوالنامہ ہے جس کو بڑی قابلیت سے مرتب کیا گیا ہے اس سوالنامہ کا پورا متن ماہنامہ ''بینات'' بابت ماہ شعبان ۸۴ھ میں شائع ہو چکا ہے۔ اس سوالنامہ کا تفصیلی جواب دینے سے پہلے بیمہ کے آغاز وانجام پر ایک نظر ڈال لینا مناسب ہے۔

بیمہ کا آغاز وانجام:

کہا جاتا ہے کہ بیمہ کی ابتداء اٹلی کے تاجران اسلحہ سے ہوئی، ان لوگوں نے یہ دیکھ کر کہ بعض تاجروں کا مال تجارت سمندر میں ضائع ہو جاتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ انتہائی تنگدستی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں اس صورت حال کا حل یہ نکالا کہ اگر کسی شخص کا مال تجارت سمندر میں ضائع ہو جائے تو تمام تاجر مل کر اس کی معاونت کے طور پر اسے ہر ماہ یا ہر سال ایک معین رقم ادا کیا کریں۔ یہی تحریک ترقی کر کے جہازوں کے بیمہ تک پہنچی کہ ہر ایک ممبر ایک مقررہ رقم ادا کرے تاکہ اس قسم کے حوادث وخطرات کے موقعہ پر نقصان کا کچھ نہ کچھ تدارک کیا جا سکے۔ یہ روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ سب سے پہلے اندلس کی مسلم حکومت کے دور میں بحری تجارت میں حصہ لینے والے مسلمانوں نے تجارتی بیمہ کی طرح ڈالی، ابتداء میں بیمہ کی شکل سادہ سی تھی بعد میں اس کی نئی نئی صورتیں نکلتی رہیں اور تجربے ہوتے رہے۔ ہالینڈ اس تجربہ میں پیش پیش رہا۔ موجودہ دور میں ایک مقررہ قسط پر بیمہ کاری کا نظام سب سے زیادہ مقبول ہے جس کو ''سرمایہ کارانہ نظام بیمہ'' کہا جاتا ہے، اب دنیا کی حکومتیں بیمہ کو لازمی قرار دے رہی ہیں جس کو ''ریاستی بیمہ'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، بیمہ کی ابتداء ۱۴۰۰ء میں بتلائی جاتی ہے، ابتداء ہوتے ہی اس کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا اور اس کے مقدمات اس کثرت سے عدالتوں میں آنے لگے کہ ۱۴۳۵ء میں اس کے لئے خاص عدالتیں مقرر کی گئیں جو صرف بیمہ کے مقدمات سماعت کریں۔ بیمہ ''بحری'' کے بہت عرصہ بعد بیمہ ''بری'' شروع ہوا۔ سلطنت آل عثمان کے زمانہ میں جب حکومت ترکی کے تجارتی تعلقات یورپ کے ملکوں سے قائم

ہوئے تو یورپین تاجروں کے توسط سے بیمہ اسلامی ملکوں میں داخل ہوا اور اس کے بارے میں علمائے وقت سے استفسارات شروع ہوئے چنانچہ تیرہویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ علامہ ابن عابدینؒ "ردالمحتار" میں تحریر کرتے ہیں:

وبماقررناه يظهر جواب ماكثر السوال عنه في زماننا وهو انه جرت العادة ان التجار اذا استاجروا مركبا من حربي يدفعون ايضاً مالا معلوماً لرجل حربي مقيم في بلاده يسمي ذلک المال "سوكره" على انه مهماهلک من المال الذي في المركب بحرق او غرق او نهب او غيره فذالک الرجل ضامن له بمقابلة مايأخذه منهم وله وكيل عنه مستامن في دارنا يقيم في البلاد السواحل الاسلامية باذن السلطان يقبض من التجار مال السوكره واذا اهلک من مالهم في البحر شئ يؤدي ذالک المستأمن للتجار بدله تماما. (۱)

ترجمہ: اور ہماری اس تقریر سے اس سوال کا جواب بھی ظاہر ہوگیا جس کے بارے میں آجکل کثرت سے سوالات کئے جارہے ہیں کہ اب طریقہ یہ ہوگیا ہے کہ تاجر جب کسی حربی سے کوئی بحری جہاز کرایہ پر لیتے ہیں تو اس کا کرایہ ادا کرنے کے ساتھ دارالحرب کے کسی باشندہ کو جو اپنے علاقہ میں مقیم رہتا ہے کچھ رقم اس شرط پر دیدیتے ہیں کہ جہاز میں لدے ہوئے مال کے آتش زدگی، غرقابی اور لوٹ مار ہوجانے کی صورت میں یہ شخص مال کا ضامن ہوگا اور اس رقم کو "سوکرہ" (بیمہ کی رقم) کہا جاتا ہے اس کا ایجنٹ ہمارے ملک کے ساحلی شہروں میں شاہی اجازت نامہ کے بعد مستأمن بن کر رہتا ہے جو تاجروں سے بیمہ کی رقوم وصول کرتا ہے اور مال کے ہلاک ہوجانے کی صورت میں تاجروں کا پورا پورا معاوضہ ادا کرتا ہے۔

(۱) رد المحتار - کتاب الجهاد - باب المستأمن - مطلب مهم فيما يفعله التجار من دفع مايسمى سوكرة..... الخ - ۴/۱۷۰

واضح ہو علامہ موصوف کے فتوے کو تو ہم بعد میں ذکر کریں گے لیکن عبارت مندرجہ بالا سے معلوم ہوا کہ بیمہ بحری کو اس زمانہ میں اچھا خاصا فروغ ہو چکا تھا، یورپی ملکوں سے جو جہاز کرایہ پر لئے جاتے تھے ان کا لازمی طور پر بیمہ کرایا جاتا تھا، بیمہ کمپنیوں کا عمل دخل ترکی حکومت میں جاری تھا، بیمہ کمپنیوں کے ایجنٹ ترکی کی بندرگاہوں پر باضابطہ سلطانی اجازت کے بعد مقیم تھے اور انہوں نے اپنے دفاتر قائم کر لئے تھے یہاں تک کہ علمائے وقت کے پاس اس بارے میں کثرت سے سوالات آنے لگے، کتب فتاوی میں ''ردالمحتار'' غالباً پہلی کتاب ہے جس میں بیمہ کے بارے میں تفصیل سے جواب دیا گیا ہو(*) بیمہ کی ابتداء جس جذبہ کے تحت ہوئی اور جس طرح وہ ارتقا کے مختلف ادوار سے گذرا وہ سب کے سامنے ہے لیکن اس کا انجام فاضل جلیل استاذ ابوزہرہ کے الفاظ میں قابل ملاحظہ ہے:

> اگر چہ اس کی اصلیت تو تعاون محض تھی لیکن اس کا انجام بھی ہر اس ادارہ کا سا ہوا جو یہودیوں کے ہاتھ میں پڑا، کہ یہودیوں نے اس نظام کو جس کی بنیاد ''تعاون علی البر والتقویٰ'' پر تھی اسے ایک ایسے یہودی نظام میں تبدیل کر دیا جس میں قمار (جوا) اور ربوا (سود) دونوں پائے جاتے ہیں۔(۱)

بیمہ کے سلسلہ میں ہندو پاک میں اجتماعی رائے حاصل کرنے کی باقاعدہ کوشش تو یہی نظر آتی ہے جو مجلس ''تحقیقات شرعیہ'' ندوۃ العلماء لکھنو نے شروع کی ہے لیکن مصر و شام میں اس پر علمی بحثیں مدت سے جاری ہیں، وہاں بیمہ کے نظام کو سمجھانے کے لئے کئی کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں۔

مصر میں تین چار سال قبل مسائل جدیدہ پر غور وفکر کرنے کے لئے ایک مجلس ترتیب دی گئی جس میں استاذ ابوزہرہ، استاذ خلاّف اور دیگر علماء شریک ہوئے، اس کے پہلے جلسے میں جو مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا بیمہ کا مسئلہ پیش کیا گیا، اس جلسہ کی پوری روئیداد مجلّہ ''لواء الاسلام'' قاہرہ میں چھپی تھی پھر شام کے مشہور فاضل مصطفیٰ الزرقاء نے مجلّہ ''حضارۃ الاسلام'' (دمشق) کے صفحات پر ''عقد التامین وموقف الشریعۃ'' کے عنوان سے بحث چھیڑی اور علماء کو دعوت دی کہ وہ اس مسئلہ پر خامہ فرسائی کریں۔ چنانچہ استاد ابوزہرہ نے استاذ الزرقاء کے جواب میں نہایت مدلل مقالہ سپرد قلم فرمایا۔

---

(۱) لواء الاسلام-بحوالہ ماہنامہ برھان-دھلی بابت ماہ مارچ سنہ ۶۰

استاذ الزرقاء کے مضمون سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علماء مصر وشام اس مسئلہ میں مختلف الخیال ہیں، اگر چہ اکثریت کا یہی خیال ہے کہ بیمہ ناجائز ہے اور جب تک کہ بیمہ کے موجودہ نظام کو تبدیل نہ کیا جائے مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں، مختلف الخیال حضرات کی آراء اور ان کے دلائل کا خلاصہ ذیل میں درج ہے:

ایک مختصر سی تعداد کا خیال ہے کہ ہر قسم کا بیمہ جائز ہے یہ حضرات بیمہ کے موجودہ نظام کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی حلت اور جواز کے قائل ہیں۔ان حضرات کے دلائل کا خاصہ یہ ہے:

(الف) بیمہ امداد باہمی کی ایک شکل ہے، تعاون اور امداد باہمی اسلامی حکم ہے۔

(ب) جس طرح ''بیع بالوفاء'' کو فقہاء نے گوارا کرلیا اسی طرح اس کو بھی گوارا کرلیا جائے۔

(ج) بیمہ کمپنی ضرورت مندوں کو جو قرض دیتی ہے اور اس پر جو سود لگاتی ہے یا بیمہ دار کو اصل مع منافع دیا جاتا ہے وہ شرعی ربوا (سود) نہیں ہے۔

دوسرا گروہ جس کی قیادت استاذ الزرقاء کے ہاتھ میں ہے اس کا خیال ہے کہ غیر سودی بیمہ جائز ہے، بیمہ میں اگر کوئی قباحت ہے تو وہ سود ہے، اس کو ختم کرنے کے بعد بیمہ کی ہمہ اقسام جائز ہیں۔

ان حضرات کے دلائل کا تجزیہ اس طرح کیا جاسکتا ہے:

(الف) **عقد موالاۃ** پر قیاس کہ اس میں ایک غیر شخص دیت وغیرہ کی ذمہ داری قبول کرلیتا ہے اور اس کے معاوضۃ میں میراث کا حصہ دار ہوجاتا ہے اسی طرح بیمہ کو بھی سمجھ لیا جائے۔

(ب) ''**ودیعة باجر**'' اور مسئلہ ''**ضمان خطر الطریق**'' میں بیمہ کی بعض صورتوں کو داخل کیا جاسکتا ہے۔

(ج) مالکیہ کے نزدیک اگر کوئی شخص کسی سے وعدہ کرے بدوں کسی عقد کے تو وہ وعدہ لازم ہوجاتا ہے اور نقصان کی صورت میں وعدہ کرنے والے پر معاوضۂ نقصان ضروری ہوتا ہے۔

تیسرا گروہ جس کی قیادت استاذ ابوزہرہ کے ہاتھ میں ہے، اس کا قائل ہے کہ بیمہ مطلقاً ناجائز ہے۔ خلاصہ دلائل یہ ہے:

(ا) بیمہ اصل وضع میں یا تو قمار ہے جبکہ مدّت مقررہ کے اختتام کے قبل ہی بیمہ دار کی موت واقع ہوجائے یا ربوا ہے جبکہ کل اقساط کی ادائیگی کے بعد بیمہ دار بیمہ شدہ رقم مع منافع حاصل کرے۔قمار اور ربوا

دونوں حرام ہیں۔

(۲) بیمہ میں صفقتان فی صفقة پایا جاتا ہے، اس کی مخالفت نص حدیث سے ثابت ہے اور اس کی ممانعت پر ائمہ اربعہ کا اتفاق و اجماع ہے۔

(۳) بیمہ سے نظام میراث درہم برہم ہو جاتا ہے کیونکہ بیمہ دار کے نامزد کردہ شخص کو بیمہ کی رقم دی جاتی ہے جبکہ ہر شرعی وارث مال متروکہ کا حقدار ہے۔

(۴) عقد صرف ہے جس میں مجلس میں قبضہ ضروری ہوتا ہے اور یہاں یہ شرط مفقود ہے۔

(۵) عقیدۂ تقدیر پر ایمان کا تقاضا ہے کہ پیش آنے والے حوادث اللہ تعالیٰ کے سپرد کردیئے جائیں اور یہاں بیمہ کرانے والے اس عقیدہ سے فرار کرتے ہیں کیونکہ وہ پہلے سے حوادث و موت کی پیش بندیاں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

بیمہ کے بارے میں علامہ ابن عابدین کا فتویٰ:

اب ہم علامہ ابن عابدین الشامی کے فتوے کی تلخیص درج کرتے ہیں واضح ہو کہ یہ مسئلہ ''مستأمن'' کے باب میں ذکر کیا گیا ہے، اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ان تاجروں کو ہلاک شدہ مال کا معاوضہ لینا جائز نہیں ہے کیونکہ التزام ما لا یلزم کی صورت ہے، اگر یہ کہا جائے کہ امانت رکھنے والا، امانت کی حفاظت پر اجرت وصول کرلے اور مال ضائع ہو جائے تو وہ ضامن ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بیمہ کے مسئلہ کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہاں مال بیمہ کمپنی کی تحویل میں نہیں ہوتا بلکہ بحری جہاز کے مالک یا اس کے ملازموں کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور اگر یہ صورت ہو کہ بیمہ کمپنی کا جہاز بھی ہو تب بھی ہلاک شدہ مال کا معاوضہ لینا جائز نہیں ہوگا کیونکہ اس صورت میں بیمہ کمپنی ''اجیر مشترک'' سمجھی جائے گی جس نے حفاظت مال اور مال لے جانے دونوں کی اجرت لی ہے اور ظاہر ہے کہ ''اجیر مشترک'' ناگہانی آفات سے مال تلف ہو جانے کی صورت میں ضامن نہیں ہوتا۔

اگر یہ کہا جائے کہ ''باب الکفالة'' میں ایک مسئلہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص نے دوسرے شخص سے کہا کہ اس راستہ پر سفر کرو راستہ قابل اطمینان ہے شخص مذکور نے راستہ پر سفر کیا، سفر میں مال ضائع ہو گیا

تو اطمینان دلانے والا شخص ضامن نہیں ہوگا برخلاف اس کے اگر اس نے ضمانت کے الفاظ بولے اور کہا کہ تیرا مال چھینے جانے کی صورت میں میں ضامن ہوں، راستہ میں مال چھین لیا گیا تو ضمانت دینے والا نقصان کا معاوضہ دے گا شارح یعنی صاحب درمختار نے دونوں مسئلوں میں فرق اس طرح کیا ہے کہ دوسرے مسئلہ میں ضمانت کے الفاظ صراحتاً پائے جاتے ہیں کیونکہ "انا ضامن" (میں ضامن ہوں) لفظوں میں موجود ہے۔اور پہلے مسئلہ میں اس طرح نہیں ہے، جامع الفصولین میں وجہ فرق اس طرح بیان کی ہے:

''قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ غرر میں آنے والا، غرر دینے والے سے ضمان اس وقت لے گا جبکہ غرر کسی عقد معاوضہ کے ضمن میں پایا جائے، یا دھوکہ دینے والا دھوکہ دیئے ہوئے شخص کے حق میں صفتِ سلامتی کا ضامن ہو مثلاً ایک شخص کسی چکی والے کے پاس گیہوں پسانے کے لئے لایا، چکی والے نے اس سے کہا کہ اس برتن میں ڈالدے اتفاق سے برتن میں سوراخ تھا اور چکی والا اس سے واقف بھی تھا تب بھی اس نے گیہوں برتن میں ڈالنے کے لئے کہدیا، گیہوں سب ضائع ہوگئے، چکی کا مالک نقصان کا ضامن ہوگا کیونکہ اس نے عقد اجارہ کے ذیل میں دھوکہ دیا حالانکہ معاملہ کا تقاضا یہ تھا کہ مال کی حفاظت رہے۔''

میں کہتا ہوں کہ اس مسئلہ میں یہ قید ضروری ہے کہ دھوکہ دینے والا نقصان سے واقف ہو اور دوسرا شخص اس سے واقف نہ ہو.....اب ظاہر ہے کہ بیمہ کمپنی کا مقصد تاجروں کو دھوکہ دینا نہیں ہوتا اور نہ ان کو جہاز کے ڈوب جانے یا آگ لگنے وغیرہ کا علم ہوتا ہے، رہا عام خطرہ تو وہ تاجر اور بیمہ کمپنی دونوں کو ہوتا ہے کیونکہ تاجر بیمہ کراتے ہی اس وقت ہیں جب ان کو خطرہ ہو اور ہلاک شدہ مال کا معاوضہ لینے کی طمع ہو لہٰذا بیمہ کے مسئلہ کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا البتہ اگر مسلمان تاجر کا کوئی حربی شریک ہو اور وہ دارالحرب میں بیمہ کمپنی سے معاملہ طے کرے اور مال ہلاک ہونے کی صورت میں معاوضہ کی رقم میں کچھ مسلمان تاجر کا بھی حصہ لگا لے تو یہ رقم مسلمان کے لئے حلال ہے کیونکہ ''عقد فاسد'' دارالحرب میں رہنے والے دو شخصوں کے درمیان ہوا ہے اور

دارالحرب والوں کا مال ان کی رضامندی سے مسلمان کو پہنچا ہے۔لہذا اس کے لینے میں کوئی امر مانع نہیں ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مسلمان تاجر دارالحرب میں ہوتا ہے اور وہاں ان کے سامنے یہ معاملہ طے کرتا ہے اور معاوضہ دارالاسلام میں لیتا ہے، کبھی اس کے برعکس بھی صورت ہوتی ہے۔یعنی معاملہ دارالاسلام میں طے ہوا اور وصولی دارالحرب میں ہوئی، پہلی صورت میں معاوضہ لینا جائز ہے کیونکہ دارالحرب میں طے کیا ہوا معاملہ کالعدم سمجھا جائے گا اور یہ کہیں گے کہ حربی کا مال اس کی خوشی سے لیا گیا ہے اس لئے جائز ہے، دوسری صورت میں عقد چونکہ دارالاسلام میں قرار پایا ہے اس لئے عقد پر فساد کا حکم لگایا جائے گا اور معاوضہ لینا ناجائز متصور ہوگا۔(۱)

جواب کی طرف............

اب ہم اصل سوالنامہ کے جواب کی طرف رجوع کرتے ہیں، ہم اپنے جواب کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، پہلے حصہ کا تعلق نظام بیمہ کی اصلاح سے ہے اس طرح کہ وہ شریعت اسلامیہ کے مطابق ہوجائے "تعاون علی الخیر" کا یہ نظام جواب قمار (جوا) اور ربوا کا مجموعہ نظر آتا ہے اپنی اصلی شکل میں ظاہر ہوکر ان لوگوں کے لئے قابل قبول ہو جو اپنے معاملات کو اسلام کی ہدایت اور روشنی سے درخشاں رکھنا چاہتے ہیں۔

بعض اسلامی ملکوں میں اب اس قسم کی فکر ہو رہی ہے کہ سودی نظام سے جس نے ہماری معاشی زندگی کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے اور جس نے قوم کی اجتماعی دولت کو گھن کی طرح کھا لیا ہے گلو خلاصی کی کوئی صورت نکلے، اسی طرح بیمہ کی اصلاح اور اس کو صحیح خطوط پر لانے کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے، یہ جذبہ بڑا قابل قدر ہے اور ضرورت ہے کہ "اقتصادیات" کے منتخب ماہرین اور ارباب بصیرت علماء ساتھ بیٹھ کر حلال اور حرام کی حدیں پیش نظر رکھ کر بیمہ کاری کا ایسا نظام دریافت کریں جس میں شریعت محمدیہ ﷺ سے سرمو تجاوز نہ

(۱) رد المحتار - کتاب الجهاد-باب المستأمن - مطلب مهم فيما يفعله التجار من دفع مايسمى سوكرة وتضمين الحربي ماهلك في المركب - ۴/۱۷۰.

ہو۔عام مسلمانوں سے بھی ہماری گذارش ہے کہ وہ اپنی حکومتوں پر جو اسلام کا نام لیتی ہیں، زور دیں اور ان پر اجتماعی وزن ڈالیں کہ وہ ان کو سود اور قمار کی لعنت سے نجات دلائیں، ان سے صاف صاف کہہ دیا جائے کہ اس یہودی نظام نے ہماری دنیا بھی خراب کر رکھی ہے اور آخرت بھی۔اس کے برعکس یہ طریق کار صحیح نہیں ہے کہ صرف ماہرین شریعت کی طرف رجوع کر کے ان سے کہا جائے کہ وہ بیمہ کو حلال کر دیں یا ضرورت و مجبوری کے نام پر کوئی حیلہ نکالیں۔

ان علماء کا کردار بھی قابل مذمت ہے جو یورپ کے ماہر اقتصادی نظام کی چند خوبیاں یا خوشنما پہلوؤں کو دیکھ کر جواز اور حلت کا فتویٰ دینے میں نہایت جری ہیں۔ان حضرات کو قرآن کریم کی آیت کریمہ ذیل پیش نظر رکھنا چاہئے:

ولا تقولوا لما تصف السنتكم الكذب هذا حلال وهذا حرام لتفتروا على الله الكذب ان الذين يفترون على الله الكذب لا يفلحون. (النحل:۱۱۶)

”اور نہ کہو اپنی زبانوں کے جھوٹ بنا لینے سے کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے تاکہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھو، بلا شبہ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھتے ہیں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے“۔

مجوزین کے دلائل کا خلاصہ آپ پڑھ چکے ہیں، دلائل کی سطحیت بالکل ظاہر ہے مثلاً اس دلیل کو آپ کیا کہیں گے کہ بیمہ کا سود ”حلال“ ہے کیونکہ قرض میں سود نہیں ہوتا، ان حضرات کو معلوم ہونا چاہئے کہ قرآن کریم کی آیت ربوا سودی تجارت اور سودی قرض کے جاہلی نظام کو ختم کرنے کے لئے نازل ہوئی تھی۔ جاہلی نظام میں قرض اور تجارت دونوں کے ذریعہ سود لیا جاتا تھا۔امام ابوبکر الجصاص الرازیؒ ”احکام القرآن“ میں لکھتے ہیں:

والثاني انه معلوم ان ربا الجاهلية انما كان قرضا موجلا بزيادة مشروطة فكانت الزيادة بدلا من الاجل فابطله الله وحرمه. (۱)

(۱) احكام القرآن للجصاص – ومن ابواب الربا الذين تضمنت الاية تحريمه – ۱/۴۶۷.

ترجمہ: ''دوسری بات یہ ہے کہ یہ امر بالکل عیاں ہے کہ زمانہ جاہلیت کا سود قرض میعادی کی شکل میں لیا جاتا تھا جس میں زیادتی شرط کرلی جاتی تھی زیادتی میعاد کا بدل ہوتی تھی اللہ تعالیٰ نے اس کو باطل قرار دیا اور حرام فرمایا۔''

''مغنی ابن قدامہ'' میں ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ سے سوال کیا گیا کہ وہ کونسا ربوا ہے جس کے انکار سے کفر لازم آتا ہے، امام موصوف نے جواب دیا۔ **هو الزيادة في الدين** وہ قرض میں زیادتی ہے۔

ربوا کے بارے میں احادیث نبویہ کا حاصل یہی ہے کہ ربوا صرف روپے کے لین دین تک محدود نہیں ہے بلکہ ربوا کے سلسلہ میں بہت سی صورتیں داخل ہیں حتی کہ ان صورتوں کو بھی حرام کردیا گیا جن میں ادھار نہیں ہے بلکہ نقد معاملہ ہے مثلاً ایک تولہ چاندی لے کر دو تولہ چاندی دیدے یا ایک من نقد گیہوں دے کر اس کے معاوضہ میں دو من گیہوں نقد لے لے۔

الغرض حدیث پاک نے ربوا کے ریشے بھی اسلام کے معاشی نظام سے نکال کر پھینک دیئے تاکہ اسلامی معاشرہ اس نجاست سے بالکل صاف و پاک ہوجائے۔

فقہ حدیث کی شرح ہے جس طرح حدیث قرآن کریم کی، اس لئے کہ فقہاء کرام نے ان ہی صورتوں کی تفصیلات مرتب کی ہیں جو حدیث میں بیان کی گئی تھیں۔ اس لئے فقہ کی کتابوں میں سود کے مباحث کو دیکھ کر بعض نام نہاد علماء اس غلط فہمی میں مبتلاء ہوگئے ہیں کہ قرآن نے جس سود کو حرام کیا ہے وہ قرض والا سود نہیں ہے بلکہ خرید و فروخت کی چند نادر شکلوں میں سود پایا جاتا ہے جو ایام جاہلیت میں مروج تھیں اور جن کا ذکر فقہ کی کتابوں میں کیا گیا ہے بعض نے **تعاونوا على البر والتقوى** اور **لا تظلمون ولا تظلمون** اس قسم کی عمومی آیات سے استدلال کیا ہے۔(۱)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات ربوا اور میسر (جوے) کی آیات کو بالکل بھول گئے ہیں، دلائل خصوص کے ہوتے ہوئے دلائل عموم سے سہارا لینا قابل تعجب ہے۔

---

(۱) الفتاوى للإمام الاكبر محمود شلتوت -ص: ۳۵۲-ط: دار القلم قاهرة مصر.

بیمہ کس لئے؟

شروع میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ بیمہ کی ابتداء نہایت سادہ تھی اور اس کا مقصد بھی صرف یہ تھا کہ نقصان زدہ تاجر کو مالی امداد دی جائے، یا اس طرح کہہ لیجئے کہ ایک فرد کی مصیبت کے بار کو بہت سے افراد پر پھیلا دیا جائے اس طرح کہ ہر ایک کو ایک خفیف سی قربانی دینا پڑے لیکن اس قربانی کے عوض جملہ افراد کو مصیبت و آفت کے وقت تعاون حاصل ہو، تعاون علی الخیر کا یہ جذبہ بڑا قابل قدر ہے، قرآن کریم نے اس جذبہ کو متعدد آیات میں ابھارا ہے اور حدیث نبوی میں اس کے فضائل بیان کئے گئے ہیں۔

بیمہ کرانے والے شخص کے پیش نظر دوسرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کے انتقال کے بعد اس کے بیوی بچوں کو تکلیف اٹھانا نہ پڑے، اس مقصد کو بھی ہم اسلامی نقطۂ نگاہ سے غلط نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ تعلیم نبوی اس کو صحیح اور بہتر قرار دے رہی ہے، سرور کائنات ﷺ ایک صحابی سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

انک ان تدع ورثتک اغنیاء خیر من ان تدعهم عالة یتکففون الناس. (۱)

تمہارا اپنے ورثہ کو غنی چھوڑنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ ان کو ایسا محتاج چھوڑو کہ وہ لوگوں سے سوال کرتے پھریں۔

اسی طرح آنحضرت ﷺ نے ازواج مطہرات سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا:

ان امرکن مما یهمنی من بعدی. (۲)

تمہارے معاملہ نے مجھ کو فکر میں ڈال رکھا ہے کہ تمہاری گذر میرے بعد کیونکر ہوگی (یعنی میں نے کوئی میراث نہیں چھوڑی ہے اور تم نے دنیا پر آخرت کو ترجیح دی ہے)

اپنے دنیا سے چلے جانے کے بعد بیوی بچوں کی فکر ایک فطری داعیہ ہے اس لئے اسلام نے اس کو ختم نہیں کیا بلکہ اس کی ہمت افزائی کی ہے، اسلام کی خصوصیت ہے کہ وہ فطری اور جبلی دواعی کو ختم نہیں کرتا بلکہ ان کے لئے مناسب اور جائز راہیں تجویز کرتا ہے۔

---

(۱) الصحیح لمسلم - کتاب الوصیة - ۲/۳۹.

(۲) مشکوۃ المصابیح - باب مناقب العشرة - الفصل الثالث - ۲/۵۶۷.

بیمہ کا شرعی حل

طالب بیمہ کے حسب ذیل مقاصد بیان کئے جاتے ہیں:

(۱) اس کا سرمایہ محفوظ رہے۔

(۲) اضافہ مال بذریعہ سود یا تجارت۔

(۳) حوادث کی صورت میں مالی معاونت، موجودہ زمانہ میں حادثوں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوگیا ہے آئے دن ہولناک قسم کے حوادث ہوتے رہتے ہیں جن میں جانی اور مالی دونوں قسم کے حوادث سے بے اندازہ نقصان ہوتا ہے۔

(۴) پس ماندگان کی مالی امداد۔

اب ان کا ترتیب وار حل درج ہے

(۱-۲) ان دونوں باتوں کا حل یہی ہے کہ "غیر سودی بینک" جاری کئے جائیں جن کی اساس شرکت اور مضاربت پر قائم کی جائے (*) اس طرح سرمایہ کی حفاظت بھی ہوگی اور مال میں بھی جائز طریقوں سے اضافہ ہوتا رہے گا۔ اسلام کے معاشی نظام کا جس شخص نے بغور مطالعہ کیا ہوگا وہ ضرور اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اسلام "ارتکاز دولت" کا حامی نہیں ہے کہ روپیہ ایک جگہ جمع کردیا جائے اور بدوں تجارت اس سے منافع حاصل کیا جائے، روپیہ سے روپیہ حاصل کرنا اسلام کے نقطۂ نظر سے صحیح نہیں ہے، سرمایہ میں جو لوگ اضافہ چاہتے ہیں ان کے لئے تجارت کی شاہراہ کھلی ہوئی ہے، تجارت سے سرمایہ دار کا بھی فائدہ ہے کہ سرمایہ میں اضافہ ہوتا رہے گا اور زکوۃ دولت کو ختم نہیں کرے گی اور ملک وقوم کا بھی فائدہ ہے کہ تجارت کو فروغ ہوگا، سرمایہ تجوریوں سے نکل کر منڈیوں اور بازاروں میں پہنچے گا، صنعت اور انڈسٹری کی کثرت ہو گی، مزدوروں اور ملازمت پیشہ لوگوں کو کام ملے گا واضح رہے کہ اسلام اپنے معاشی نظام کی بنیاد زکوۃ پر رکھتا ہے برخلاف سرمایہ دارانہ نظام کے کہ وہاں سود ریڑھ کی ہڈی کا حکم رکھتا ہے، قرآن کریم نے اسلام کے معاشی نظام کو مختصر سے مختصر لفظوں میں اس طرح سمجھایا ہے:

کی لا یکون دولة بین الاغنیاء (الحشر:۷)

"تاکہ نہ آئے لینے دینے میں صرف دولتمندوں کے تم میں سے۔"

آیت کریمہ کا حاصل یہ ہے کہ یہ مصارف (اس سے پہلے مصارف بتلائے گئے ہیں) اس لئے بتلائے ہیں کہ ہمیشہ یتیموں محتاجوں، بے کسوں اور عام مسلمانوں کی خبر گیری ہوتی رہے اور عام اسلامی ضروریات سرانجام پاسکیں یہ اموال محض چند دولتمندوں کے الٹ پھیر میں پڑ کران کی مخصوص جاگیر بن کرنہ رہ جائیں جس سے صرف سرمایہ دار اپنی تجوریوں کو بھرتے رہیں اور غریب فاقوں سے مریں۔

غیر سودی بینک کا اجراء کوئی محض تخیلی چیز نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے جس کو بڑی آسانی سے بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔یورپ کی ذہنی غلامی نے دماغوں پر یہ عقیدہ مسلط کردیا ہے کہ سود کے بغیر معاشی نظام چل ہی نہیں سکتا، ان حضرات کو معلوم ہونا چاہئے کہ آج بھی کچھ ممالک ایسے ہیں جہاں سودی نظام اور بینکنگ کا سارا کاروبار موجود نہیں ہے اور بایں ہمہ وہ ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہیں بلکہ ان کی معاشی حالت سودی ملکوں سے زیادہ بہتر ہے۔اگر کچھ اسلامی حکومتیں ہمت کر کے سود کے اس نظام سے نجات حاصل کر لیں تو بین الاقوامی طور پر بھی اس کا اثر ہو، بینک آف انگلینڈ قسم کے بین الاقوامی بینک ان ملکوں کو غیر سودی کاروبار کی سہولتیں مہیا کریں اور لوگوں کا یہ عذر کہ ہم سود کے بغیر بین الممالک تجارت کس طرح کر سکتے ہیں، ختم ہوجائے۔

(۳)''دنیا حوادث کی آماجگاہ ہے'' یہ مقولہ پہلے بھی صادق تھا اور اب تو ایسی حقیقت بن چکا ہے جس سے انکار ناممکن ہے، روزانہ حادثے ہوتے رہتے ہیں جن میں جانی اور مالی دونوں قسم کے نقصانات ہوتے ہیں۔ہم دیکھتے ہیں کہ کل تک ایک بھلا چنگا آدمی ہاتھ پیروں سے صحیح وسالم تھا آج اچانک کسی حادثے کی زد میں آگیا اور اپاہج ہوکر رہ گیا، اس اپاہج انسان کے ساتھ اس کا خاندان بھی مصائب وحوادث کا شکار ہے، نہ پیٹ بھرنے کو روٹی ہے اور نہ تن ڈھانپنے کو کپڑا رہا، اسی طرح ایک بڑا صنعت کار جو کل تک ایک بڑی انڈسٹری کا مالک تھا اچانک کارخانہ میں آگ لگ گئی مشینری اور سارا سامان جل کر راکھ ہوگیا اور وہ اب نان جویں کو بھی محتاج ہے، پھر ہر روز بسوں، موٹروں کے حادثے ہماری زندگی کا روزمرہ بن چکے ہیں آخران نقصانات کی تلافی کس طرح ہو اور اس کا حل شریعت میں کیا ہے؟

اس کا حل یہی ہے کہ امداد باہمی اور تعاون علی الخیر کے جذبے کے تحت ایسے ادارے قائم کئے جائیں جو ارباب خیر اور مالداروں سے عطیات وصول کریں اور ان سے جمع شدہ رقوم کو تجارت اور انڈسٹری

میں لگائیں ان اداروں کا کام یہ ہو کہ وہ تحقیق حال کے بعد نقصان زدہ افراد اور خاندانوں کی مالی امداد کریں اس سلسلہ میں ''عام ادارے'' بھی بنائے جاسکتے ہیں اور ''خاص'' بھی۔ خاص کہ یہ صورت ہو کہ تاجر اپنا الگ ادارہ بنائیں صنعت کار اپنا الگ۔ اسلامی حکومت اگر اس سلسلہ میں جبر کرنا چاہے تو جبر بھی کرسکتی ہے کیونکہ حکومت کو زکوٰۃ کے علاوہ بھی بعض صورتوں میں رعایا سے جبری عطیات وصول کرنے کا حق ہے۔

فان اريد بها مايكون بحق ككرى النهر المشترك واجر الحارس والموظف لتجهيز الجيش وفداء الاسارى وغيرها جازت الكفالة بها على الاتفاق. (۱)

''اگر اس سے وہ ٹیکس مراد ہیں جو جائز اور صحیح ہیں جیسے مشترک نہر کا کھودنا، پولیس کی تنخواہ یا فوج کا انتظام کرنے والوں کی تنخواہ جو سب پر ڈالی جائے یا قیدیوں کو کافروں سے چھڑانے کے لئے عطیات تو اتفاقاً ان کی کفالت کی جاسکتی ہے۔''

''ضررعام''''ضرر خاص'' سے مقدم ہے یہ بھی تو اسلامی قانون کا اصول ہے، ان تعاونی اداروں کے علاوہ دوسرا اقدام یہ ہو کہ معاقل کے اسلامی نظام کو پھر سے اسلامی معاشرہ میں جاری کیا جائے۔

معاقل

معاقل، معقلة کی جمع ہے ''خون بہا'' کو کہتے ہیں عقل کے معنی روکنے اور منع کرنے کے ہیں اور دیت کے طریق کار سے لوگوں کی جانیں مفت میں چلی جانے سے محفوظ ہوجاتی ہیں اس لئے خون بہا کو ''عقل'' کہتے ہیں اور ''عاقلة'' اس جماعت کو کہتے ہیں جو قاتل کی طرف سے اجتماعی طور پر ''خون بہا'' ادا کرتی ہے۔ ہجرت کے بعد جب رسول اللہ علیہ وسلم نے انصار اور مہاجرین کے درمیان ''بھائی چارہ'' قائم کرایا تو ایک دستاویز بھی تحریر فرمائی جس میں دونوں کو ایک جماعت قرار دے کر حوادث اور نقصانات کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈالی۔

محدث کبیر ابن ابی شیبہؒ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے:

(۱) الهداية – كتاب الكفالة – ۳/۱۲۵ – ط: مكتبة شركت علمية.

كتب رسول الله ﷺ كتاباً بين المهاجرين والانصار ان يعقلوا معاقلهم وان يفدوا عانيهم بالمعروف والاصلاح. (۱)

ترجمہ: جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار اور مہاجرین کے لئے ایک تحریر لکھوائی جس میں یہ تھا کہ انصار اور مہاجرین ایک دوسرے کی دیت ادا کریں گے اور اگر کوئی قید ہو جائے تو اس کا فدیہ ادا کریں گے، قاعدہ قانون اور اصلاح باہمی کے طریق پر۔

قبائلی سسٹم میں قبیلہ عاقلہ سمجھا جاتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب دواوین کو ترتیب دیا تو ''اهل الديوان'' عاقلہ قرار پائے۔ پیشوں کی بنیاد پر بھی ایک پیشہ والوں یعنی برادری کو عاقلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

ولهذا قالوا لو كان اليوم قوم تناصرهم بالحرف فعاقلتهم اهل الحرفة(۲)

ترجمہ: اسی بنا پر مشائخ نے فرمایا ہے کہ اگر آجکل تناصر (اعانت باہمی) پیشوں کے طریق پر رائج ہوتا ہو تو ایک پیشہ میں منسلک افراد (برادری) عاقلہ قرار دیئے جائیں گے۔

عاقلہ پر ذمہ داریاں ڈالنے کی غرض وغایت اور اس کی حکمت امام سرخسیؒ اس طرح بیان کرتے ہیں:

عاقلہ پر ذمہ داریاں ڈالنا عقلی طور پر یوں سمجھئے: قاتل جب فعل قتل کا ارتکاب کرتا ہے تو اس اقدام میں خارجی قوت وطاقت کو بڑا دخل ہوتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ قتل کی پاداش میں جب میں پکڑا جاؤں گا تو میرے حمایتی (قبیلہ یا برادری) میری مدد کو پہنچیں گے، اب حمایت ونصرت کے چند اسباب ہوتے ہیں، کبھی یہ اہل دیوان کی یکجہتی پر مبنی ہوتی ہے، کبھی قبیلوں اور خاندان والوں کی بنیاد پر ہوتی ہے، کبھی محلے اور پیشوں کی بنا پر ہوتی ہے، چونکہ قاتل ضرورت کے وقت ان ہی سے قوت وطاقت حاصل کرتا ہے، اس لئے خون بہا بھی ان ہی پر لگایا جائے گا تاکہ یہ لوگ اپنے میں سے ناسمجھ اور بیوقوف لوگوں کو اس قسم کی حماقتوں سے روکیں، خون بہا کا مال بھی کافی مقدار میں ہوتا

(۱) نصب الراية لأحاديث الهداية – كتاب المعاقل – ۳۹۸/۴ – رقم الحديث: ۸۰۳۴ – ط: دار القبلة جدة.

(۲) الهداية – كتاب المعاقل – ۶۴۶/۴.

ہے اس لئے سب پر ڈالنے سے وصولی میں بھی آسانی ہو جاتی ہے ہر ایک شخص ادا بھی
اس خیال سے کر دیتا ہے کہ کل اگر مجھ سے بھی اس قسم کا فعل سرزد ہو گیا تو یہی لوگ میرا
خون بہا ادا کریں گے۔(۱)

اسی طرح اگر کسی مقام پر کوئی مقتول پایا جائے اور قاتل کا پتہ نہ چل سکے تو وہاں کی آبادی ازروئے شرع اجتماعی طور پر اس کا خون بہا ادا کرتی ہے۔لہٰذا ان مسائل کی روشنی میں ایسا طریق کار اختیار کیا جا سکتا ہے کہ حادثات کی صورت میں ہر پیشہ کا عاقلہ (برادری یا یونین) خون بہا ادا کرے مثلاً بسوں اور ٹرکوں کے مالک ایک عاقلہ قرار دیئے جائیں، کسی کی بس سے کوئی جانی یا مالی نقصان ہو جائے تو ان کی انجمن ادائیگی نقصان کی ذمہ دار ہو اس سلسلہ کو دوسرے پیشوں اور حرفوں تک بھی پھیلایا جا سکتا ہے اور ان کے قواعد وضوابط بنائے جا سکتے ہیں.عاقلہ پر ذمہ داری ڈالنا یقیناً ان حوادث میں کمی کا باعث بھی بن سکتا ہے جبکہ حوادث میں بے پناہ اضافہ ہو چکا ہے اور دن بدن ہو رہا ہے اور اب تو انشورنس کے نظام کی وجہ سے یہ عالم ہو گیا ہے کہ لوگ خود اپنی موٹروں ،ٹرکوں ،کو حادثہ کا شکار بنانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اس طریقہ سے بیمہ کمپنی سے معقول رقم وصول کی جائے۔رہی قانونی گرفت تو اس سے بچنے کی راہیں تو ملک کے نرم قوانین اور پھر وکلاء کی موشگافیوں نے بڑی حد تک ہموار کر رکھی ہیں۔

(۴) چوتھا مقصد بیمہ کا یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے ذریعہ پسماندگان کی مالی امداد بڑی حد تک ہو جاتی ہے لوگ بیمہ اس لئے کراتے ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی اولاد کس مپرسی کے عالم میں مبتلا نہ ہو،اس مقصد کے سلسلہ میں عرض ہے کہ اگر کسی جگہ اسلامی نظام معیشت کی ترویج صحیح معنی میں ہو تو کوئی باپ اپنے مرنے سے اس لئے خوف زدہ نہیں رہ سکتا کہ میرے مرنے کے بعد میری اولاد مصیبتوں کی شکار ہوگی کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اسلام کے دستور مملکت میں یہ دفعہ بھی شامل ہے۔

حدثنا محمود قال: اخبرنا اسرائیل عن ابی حصین عن ابی صالح عن
ابی هریرة قال: قال رسول الله ﷺ: انا اولی بالمومنین من انفسهم
فمن مات وترک مالا فماله لموالی العصبة ومن ترک کلاً او ضیاعاً

---

(۱) كتاب المبسوط للسرخسي – كتاب الديات– ٢٦/٢٦–ط: دار الكتب العلمية بيروت.

فانا ولیّه فلادع له. (۱)

ترجمہ:'' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں مومنین سے ان کی جانوں سے بھی زیادہ قریب ہوں لہٰذا جو شخص مال چھوڑ کر مرے تو وہ مال اس کے عصبات کا حق ہے اور جو شخص عاجز و درماندہ قرابتدار اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑے تو مجھے اس کے لئے بلایا جائے۔''

نہ صرف شخص متوفی کے پسماندگاں کی مالی امداد اسلامی حکومت کے ذمہ ہے بلکہ اگر اس پر کسی کا قرض بھی ہو تو اس کو بارِ آخرت سے سبکدوش کرانا اور قرض خواہ کو اس کا حق دلوانا بھی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

فمن مات وعليه دين ولم يترك وفاءً فعلي قضاءه (۲)

ترجمہ:''پس جس شخص نے انتقال کے بعد قرض چھوڑا اور اس کی ادائیگی کا کوئی سامان نہیں ہے تو میرے ذمہ اس کی ادائیگی ہے۔''

اس کے ساتھ ہی ساتھ عام ناداروں اور غریبوں کی کفالت بھی اسلامی حکومت کی ذمہ داریوں میں داخل ہے. جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض وقت قرض لے کر ناداروں اور غریبوں کی دادرسی فرمائی ہے اور ان کو ننگا بھوکا نہیں رہنے دیا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ عہد رسالت میں اس ادارہ کے نگراں تھے۔ ابوداؤد اور بیہقی نے بلالؓ کی زبانی یہ روایت بیان کی ہے:

وكنت انا الذى الى ذلك عنه منذ بعثه الله حتى توفى وكان عليه السلام اذا اتاه الانسان مسلماً يراه عارياً يا مرنى فانطلق فاستقرض فاشترى له البردة فاكسوه واطعمه (۳)

---

(۱) الصحيح للبخاري – كتاب الفرائض – باب ابني عم أحدهما أخ لام ..... الخ – ۲/۹۹۸، ۹۹۹.

(۲) سنن أبي داؤد – كتاب الفرائض – باب في ميراث ذوي الأرحام – ۲/۴۰۲.

(۳) الترتيب الادارية – القسم الثاني في سائر العمالات – باب في المنفق على رسول الله – ۱/۴۴۲ – ط: المطبعة الأهلية بدرب الفاسي.

اور میں ہی آپ کی بعثت سے لے کر وفات تک اس کا نگران تھا آپ کے پاس اگر کوئی مسلمان ننگا بھوکا آجاتا تھا تو آپ مجھے حکم دیتے تھے میں جا کر کسی سے قرض لیتا تھا، پھر اس رقم سے اس کے لئے کپڑے اور کھانے کا انتظام کرتا تھا۔''

اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رسالت مآب ﷺ کی طرف سے ہدایت تھی:

أنفق بلالاً ولا تخش من ذی العرش اقلالا.(۱)

بلال! خوب خرچ کیا کرو اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرتے رہو۔ تنگدستی سے نہ ڈرا کرو۔''

غلاموں کے اوپر خرچ کرنے میں اگر کسی آقا سے کوئی کوتاہی ہو جاتی تھی تو ان کے اخراجات بھی اس ادارہ کے ذمہ ہوتے تھے، مروان بن قیس دوسی کے حالات میں مروی ہے کہ ان کے پاس دو غلام تھے، وہ ان کے اخراجات پورا کرنے میں ہمیشہ بخل سے کام لیتے تھے، ان دونوں نے بارگاہِ رسالت میں شکایت کی، شکایت سنتے ہی حضرت بلال کو حکم دیا گیا:

فأمر بلالا ان یقوم بنفقتهما.

بلال کو حکم دیا کہ ان دونوں کے نفقہ کا انتظام کریں۔

ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ ایک شخص کے پاس مال وغیرہ سب کچھ ہے لیکن اس کے بچے چھوٹے ہیں ڈرتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد مال متروکہ کو صحیح طریقہ پر خرچ نہیں کیا جائے گا۔ مال کی نگرانی اور اس کی حفاظت میں دشواریاں ہونگی اس لئے اپنے مال کو بیمہ کمپنی کے سپرد کر دیتا ہے، تاکہ مال نقصان سے محفوظ رہے اور بچوں کی ضرورت (تعلیم شادی وغیرہ) کے موقعہ پر ان کے مصارف پورے ہوتے رہیں۔ اس صورت کا حل ''وصایۃ'' کے نظم میں موجود ہے یعنی اس شخص کو چاہئے کہ کسی کو اپنا وصی مقرر کر جائے۔ ''وصی'' کے باضابطہ فرائض ہیں اور وہ ان کے لئے مسئول ہے جس کو فقہ کی کتابوں میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، اجمالی فرائض کا نقشہ ''ہدایہ'' میں اس طرح دیا گیا ہے:

الا فی شراء کفن المیت وتجهیزه... وطعام الصغار وکسوتهم ... ورد الودیعة بعینها ورد المغصوب والمشتریٰ شراء فاسداً وحفظ

(۱) الترتیب الاداریة -المرجع السابق.

المـال وقضاء الديون...... وتنفيذ وصية بعينها...... والخصومة في حق الميـت...... وقبول الهبة...... وبيع ما يخشى عليه التوى والتلف...... و جمع الاموال الضائعة.(۱)

میت کے کفن کی خریداری اور اس کی تجہیز وتکفین چھوٹے نابالغ بچوں کے خورد ونوش اور کپڑوں کا انتظام، امانت اور غصب کئے ہوئے اموال کی اور بیع فاسد سے خریدے ہوئے مال کی واپسی، مال وجائیداد کی حفاظت قرضوں کی ادائیگی، وصیت کے نفاذ کے انتظامات، مرنے والے کے کسی حق کے لئے نالش کرنا، ہبہ قبول کرنا۔ جن چیزوں کے خراب ہونے کا ڈر ہو ان کو فروخت کرنا گمشدہ اموال کی واپسی کی کوشش کرنا۔

''وصایۃ'' کے نظم پر عہد رسالت اور دور صحابہ میں برابر عمل ہوتا رہا، چنانچہ جعفر بن ابی طالب کی شہادت کے بعد جناب رسول اللہ ﷺ نے حضرت جعفر کے دونوں صاحبزادوں محمد اور عبداللہ رضی اللہ عنہما کی ''وصایت'' کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے فرمایا:

انا وليهم في الدنيا والآخرة.

میں دنیا اور آخرت دونوں میں ان کا سرپرست ہوں۔

اور صاحب ''سمط الجواہر الفاخر'' نے ایسے متعدد یتیم بچوں کے نام گنائے ہیں جن کے آپ وصی تھے، جن میں سے تین کو یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

۱:۔محمد بن عبداللہ بن جحش: ان کے والد ماجد غزوہ احد میں شہید ہو گئے تھے۔شہادت سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وصی مقرر فرما دیا تھا آپ نے ان کے لئے خیبر میں زمین خریدی جس سے ان کے اخراجات پورے ہوتے تھے اور مدینہ منورہ کے ''سوق الرقیق'' میں ایک گھر بطور عطیہ دیا جس میں ان کی رہائش تھی۔

۲:۔ام زینب بنت نبیط: ان کے والد سعد بن زرارہ نے آپ کو وصی مقرر کیا تھا۔

(۱) الهداية- كتاب الوصايا-باب الوصي ومايملكه -۴/۲۹۴، ۲۹۵.

۳:۔قبیلہ بنی لیث بن بکر کی ایک بچی:اس کے بھی آپ وصی تھے۔

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ بار ''وصایت'' کے اٹھانے میں بڑے مشہور تھے چنانچہ ان کو سات جلیل القدر صحابہ حضرت عثمان، عبدالرحمن بن عوف، مقداد بن الاسود، ابن مسعود، زبیر بن بکار، مطیع بن الاسود، ابوالعاص بن الربیعؓ نے وصی مقرر کیا تھا(۱) ابوعبداللہ السنوی نے سات کے بجائے ستر کا ذکر کیا ہے، چنانچہ کہا ہے:

واصی الیہ سبعون من الصحابة باموالهم واولادهم فحفظها وكان ينفق عليهم من ماله. (۲)

ستر صحابہ نے ان کو اپنے اموال واولاد کا نگراں مقرر کیا تھا حضرت زبیر ان پر اپنا مال بھی خرچ کردیا کرتے تھے۔''

اگر کسی نے اپنا وصی مقرر نہیں کیا ہو تو اس کے اموال کی حفاظت اور اولاد کی صیانت کے لئے حاکم کو حق دیا گیا ہے کہ وہ وصی مقرر کردے ورنہ ''بیت المال'' میں ان کے اموال جمع کرے اور حسب ضرورت خرچ کرتا رہے۔

جواب کا حصہ دوم

سوالنامہ کے فاضل مرتب نے جو سوالات قائم کئے ہیں یہاں ہم ان کو مع جوابات ترتیب سے درج کرتے ہیں

سوال:۱- انشورنس کی جو حقیقت بیان کی گئی ہے اس میں کمپنی جو رقم بطور سود دیتی ہے جس کا نام وہ اپنی اصطلاح میں منافع رکھتی ہے شریعت کا اصطلاحی ربوا ہے یا نہیں؟

جواب: بیمہ کی حقیقت جن حضرات کے پیش نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ بیمہ میں دو طرح سے شریعت کا اصطلاحی ربوا پایا جاتا ہے ایک تو یہ کہ بیمہ کمپنی بیمہ داروں سے جو رقم وصول کرتی ہے وہ ضرورت

(۱) اسد الغابة في معرفة الصحابة—ذكر زبير بن العوام—۱۹۸/۲، ۱۹۹—ط: المكتبة الاسلامية ايران.

(۲) التراتيب الادارية —المرجع السابق.

مندوں کوسود پر قرض دیتی ہے، دوسرے بیمہ داروں کو ان کی کل اقساط کی ادائیگی جو رقم بطور زائد منافع دیتی ہے وہ سود ہوتی ہے کیونکہ بیمہ دار جو رقم بصورت اقساط جمع کراتا ہے وہ دین ہے اور دین میں اجل (میعاد کے مقابلہ میں جو منافع بطور مشروط یا معروف دیا جائے وہ شرعی اور اصطلاحی ربوا ہے جس کی حرمت قرآن کریم، احادیث نبوی اور اجماعت امت سے ثابت ہے، علاوہ ازیں خود سوالنامہ کے مرتب کو اعتراف ہے:

''حقیقت کے لحاظ سے انشورنس کا معاملہ ایک سودی کاروبار ہے جو بینک کے کاروبار کے مثل ہے دونوں میں جو فرق ہے وہ شکل کا ہے، حقیقت کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے''۔

جن نام نہاد علماء نے انشورنس کے کاروبار کو بالکل جائز قرار دیا ہے ان کے پاس لے دے کے صرف یہ دعوی رہ جاتا ہے کہ قرض میں جو منافع دیا جاتا ہے وہ شرعی اصطلاحی ربوا نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ یہ دعوی بالکل غلط ہے اور شریعت محمدیہ پر بہت بڑا بہتان ہے، ہم اس دعوے کی تردید پچھلے صفحات میں کر چکے ہیں اور بتلا چکے ہیں کہ قرآن کریم کی آیت ربوا قرض اور تجارت ہر دو کے جاہلی نظام کو ختم کرنے کے لیے نازل ہوئی تھی، جاہلی نظام میں قرض اور تجارت دونوں کے ذریعہ سود لیا جاتا تھا، اور یہ ایسی واضح حقیقت ہے کہ اس سے انکار ناممکن ہے، ہمارے سارے اسلامی لٹریچر کا ایک ایک حرف اس کی دلیل ہے، پچھلے صفحات میں ہم امام ابوبکر الجصاص الرازی کی زبانی آیات ربوا کا پس منظر بتلا چکے ہیں یہاں اس پر مزید اضافہ حاضر خدمت ہے حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں:

وروی مالک عن زیادبن المسلم فی تفسیر الایة قال کان الربوا فی الجاهلية أن یکون للرجل علی الرجل حق إلی اجل فإذا حل قال أتقضی أم تربی فإن قضاه أخذ وإلا زاد فی حقه وزاد الاخر فی الاجل(۱)

امام مالک زید بن اسلم سے آیت ربوا کی تفسیر میں اس طرح روایت کرتے ہیں کہ جاہلیت کا ربوا اس طرح ہوتا تھا کہ ایک کا دوسرے پر کوئی حق ہوتا تھا (حق عام ہے،

(۱) فتح الباری -کتاب البیوع -باب قول الله عزو وجل: یا ایها الذین امنوا لاتاکلوا الربا اضعافا ۳۱۳/۴.

قرض ہو، خریدی ہوئی چیز کی قیمت ہو یا کچھ اور) اور اس کی ادائیگی کی ایک مدت مقرر ہوتی تھی جب مدت آجاتی تھی تو وہ کہتا تھا کہ ادا کرو گے یا سود دو گے؟ وہ اگر ادا کر دیتا تھا تو رقم میں اضافہ نہیں ہوتا تھا ورنہ وہ اس کے حق (مال) میں اضافہ کر دیتا تھا اور دوسرا اس کے عوض مدت بڑھا دیا کرتا تھا''۔

اور ابن رشد الکبیر ''المقدمات'' میں لکھتے ہیں

وکان ربا الجاهلية في الديون أن يكون للرجل على الرجل الدين فإذا حل قال له أتقضي أم تربي فإن قضاه أخذ وإلا زاده في الحق وزاده في الاجل فأنزل الله في ذلک ما أنزل.

جاہلیت کا ربو (سود) دیون میں ہوتا تھا، ایک شخص کا دوسرے کے ذمہ کچھ واجب الادا دین ہوتا تھا جب ادائیگی کی میعاد آجاتی تھی تو وہ اس سے معلوم کرتا تھا کہ ادائیگی کا ارادہ ہے یا سود کا، اگر مدیون ادا کر دیتا تو دائن اپنی رقم (بغیر سود) لے لیتا ورنہ مدیون رقم میں اضافہ کرتا اور دائن میعاد میں تو اللہ تعالیٰ نے آیت ربوا نازل فرمائی۔

پھر ابن رشد اس ربو کو حلال سمجھنے کے بارے میں فتوی دیتے ہیں

فمن استحل الربا فهو كافر حلال الدم يستتاب فإن تاب وإلا قتل قال الله عزوجل ومن عاد فاولئک اصحاب النار هم فيها خلدون (۱)

جو شخص ربو کو حلال سمجھے وہ کافر ہے جس کو قتل کرنا حلال ہے پہلے اس سے توبہ کرائی جائے گی توبہ کرے تو بہتر ہے ورنہ قتل کر دیا جائے گا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ جو لوگ ممانعت کے باوجود پھر سود لیتے ہیں وہ دوزخی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ائمہ مجتہدین نے بھی اس سے یہی سمجھا ہے، امام محمد بن ادریس القرشی المطلبی فرماتے ہیں:

وذلک أن الربا منه يكون في النقد بالزيادة في الكيل والوزن ويكون في الدين بزيادة الأجل. (۲)

---

(۱) المقدمات الممهدات لابن رشد الكبير – كتاب الصرف – فصل في معنى الربا – ۲/۲۴۳.

(۲) كتاب الأم – باب الربا – باب الطعام بالطعام – ۳/۱۲، ۱۳.

ربوا نقد میں بھی ہوتا ہے اور ادھار میں بھی نقد میں تو یہ ہے کہ ناپ تول میں اضافہ کر دیا جائے ادھار میں یہ ہے کہ میعاد کی زیادتی کے عوض دین میں اضافہ کر دیا جائے۔

پھر یہ مسئلہ ایسا اجتماعی اور اتفاقی ہے کہ کسی کو اس سے سر مو انحراف کی گنجائش نہیں ہے قاضی ابوالولید بن رشد رقم فرماتے ہیں کہ:

علماء کا اتفاق ہے کہ ربوا دو چیزوں میں پایا جاتا ہے:

۱-تجارت کی بعض صورتوں میں، ۲-اس چیز میں جو ذمہ میں آ جائے مثلاً خریدی ہوئی چیز کی قیمت یا قرض یا سلم وغیرہ ذمہ میں جو چیز آ جائے اس کی دو قسمیں ہیں: ایک قسم تو متفق علیہ ہے اور وہ زمانہ جاہلیت کا ربوا ہے جس کی ممانعت کی گئی ہے اور اس کی صورت یہ تھی کہ وہ میعاد کے اضافے کے بدلے اصل واجب الادا رقم میں اضافہ کر دیا کرتے تھے وہ کہتے ہیں کہ ''انظرنی أزدک'' (مدت بڑھا دو میں اس کے عوض بڑھتی دے دوں گا) یہ وہی سود ہے جس کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جاہلیت کا ربوا ختم کر دیا گیا ہے اور سب سے پہلے میں عباس بن عبدالمطلب کے ربوا کو ختم کرتا ہوں''۔(۱)

شیخ ابوبکر بن العربی نے احکام القرآن میں آیت ربوا پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے اس کے ایک حصہ کا ترجمہ ہدیہ ناظرین ہے:

''الربا'' لغت میں زیادتی کو کہتے ہیں، زیادتی میں مزید علیہ یعنی وہ چیز جس پر زیادتی کی جائے ہونا ضروری ہے اس بناء پر اختلاف ہوا کہ یہ آیت ہر قسم کے ربوا کے حرام ہونے میں عام ہے یا یہ مجمل ہے، جس کے لیے حدیث کے بیان وتشریح کی ضرورت ہے، صحیح یہی ہے کہ آیت عام ہے، زمانہ جاہلیت میں جو ربوا رائج تھا وہ بالکل مشہور ومعروف طریقہ پر ان کے یہاں رائج تھا، (اس میں نہ کوئی ابہام ہے نہ اجمال) ایک شخص کسی سے کوئی چیز خرید کر قیمت اسی وقت ادا نہیں کرتا تھا بلکہ ادائیگی کی ایک

(۱) بداية المجتهد-الباب الثاني في بيوع الربا- الربافي شيئين-۴/۲۹۶-ط: دار الكتب العلمية.

مدت مقرر کر لی جاتی تھی جب میعاد پوری ہوتی تو فروخت کرنے والا خریدار سے پوچھتا تیرا ارادہ ادائیگی کا ہے یا سود دینے کا؟ جیسا وہ جواب دیتا اسکے مطابق عمل ہوتا، اللہ تعالیٰ نے ان سب کو حرام فرمایا۔

یہ ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ زیادتی مزید علیہ (جس پر زیادتی کی جائے) کے بغیر ممکن نہیں ہے لہذا جب کسی چیز کو غیر جنس کے مقابلہ میں فروخت کیا جائے تو زیادتی (بڑھتی) ظاہر نہیں ہوتی اور جب جنس کے مقابلہ میں فروخت کیا جائے، جب بھی زیادتی اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتی جب تک شریعت اس کو ظاہر نہ کرے، اسی لیے یہ آیت بعض لوگوں کو مشکل معلوم ہوئی اور وہ مختلف قسم کے اشکالات میں مبتلا ہو گئے لیکن جن حضرات کو اللہ تعالیٰ نے شریعت کے علوم کی روشنی عطا فرمائی ہے وہ آیت کریمہ کو سمجھنے میں کسی قسم کی دقت محسوس نہیں کرتے، جن لوگوں کا خیال ہے کہ آیت مجمل ہے وہ لوگ درحقیقت شریعت کے محامل قطعیہ کو نہیں سمجھتے، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی قوم کی طرف مبعوث فرمایا جن کی زبان عربی تھی، تجارت، بیع اور ربوا وغیرہ الفاظ ان کے ہاں عام طور پر سمجھے جاتے تھے، لہذا ان کو ان معاملات میں صحیح اور سچی بات کی ہدایت کی اور ان چیزوں سے منع کیا جو ناجائز اور غلط تھیں چنانچہ ارشاد فرمایا:

لاتأكلوا أموالكم بينكم بالباطل إلاأن تكون تجارة عن تراض منكم

(اے ایمان والوں نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کے آپس میں ناحق مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی خوشی سے) واضح رہے کہ یہاں باطل سے مراد یہ ہے کسی کے مال کو عقد معاوضہ میں بغیر عوض کے لے لینا۔

اور تجارت، بیع (خرید و فروخت کے ہم معنی ہے پھر اس کی قسمیں بتلائی ہیں اور الربوا لغت میں زیادتی (بڑھوتری) کو کہتے ہیں اور آیت میں ربوا سے مراد وہ زیادتی ہے جس کے مقابلے میں عوض نہ ہو، دونوں آیتوں کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیع مطلق کو حلال کیا ہے، جس میں بشرط صحت قصد و عمل معاوضہ پایا جائے اور جس

میں معاوضہ اس طریقہ پر نہ پایا جائے وہ حرام ہے۔

اہل جاہلیت میعاد اور مدت کے عوض میں بڑھتی کے خواہاں ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ بیع تو ربوا کی طرح ہے یعنی جس طرح ایک شخص قیمت میں زیادتی لے سکتا ہے تو اس میں کیا حرج ہے کہ میعاد پر نہ دینے کی صورت میں مدت کے عوض زیادتی لے لے ان کے اس خیال باطل کو رد فرمایا۔

اب یہ قرار پایا کہ اموال ربویہ میں معاوضہ کی مقدار (یعنی مساوات) شریعت نے اپنے ذمہ لے لی ہے، اب کوئی شخص ان میں زیادتی کسی طرح کی میعاد وغیرہ کے مقابلہ میں نہیں لے سکتا۔(۱)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے ربوا کی بڑی جامع و مانع تعریف بیان فرمائی ہے وہ فرماتے ہیں:

الربا وهو القرض على أن يؤدى إليه أكثر أو أفضل مما أخذ(۲)

ربوا وہ قرض ہے جو اس شرط پر ہو کہ قرض دار قرض خواہ کو جتنا لیا ہے اس سے زیادہ یا اس سے اچھا واپس کردے۔

ربوا شرعی پر علامہ محمود الحسن خان صاحب ٹونکی صاحب معجم المصنفین نے بڑی دقیق بحث فرمائی ہے ہم یہاں اس کا ایک حصہ نقل کرتے ہیں:

ربوا اور بیع لغات عرب میں سے ہیں جب تک کوئی اصطلاح شرعی توقیفی خلاف لغت کے مغیر نہ ہو، کتاب وسنت کے معنی لغت عربی سے معلوم ہوتے ہیں، ربوالغۃ زیادت ہے اور لسان العرب وغیرہ سے ثابت ہوچکا ہے کہ حقیقت بیع کی "معاهدة فی تعاوض الاموال" ہے پس لغوی اعتبار سے ربوا کی تعریف یہ ہے کہ تعاوض الاموال کے معاہد میں عوضین مماثلین میں سے ایک عوض کا دوسرے عوض پر زیادت مذکور ہونا

---

(۱) احكام القرآن لابن العربى -تحت أية الربوا- ۱/ ۲۴۲.

(۲) حجة الله البالغة-من أبواب ابتغاء الرزق -البيوع المنهى عنها- ۲/ ۱۸۸ -ط: قديمى كراتشى.

(مذکور نہ ہو بلکہ معروف ہو اس کا بھی یہی حکم ہے) باجماع امت ربوا دو قسم پر ہے ایک حسی جس کو کتاب اللہ نے "لاتأکلوا الربوا اضعافا مضاعفة" میں بیان فرمایا اور حدیث صحیح "الفضل ربوا" میں اسی حسی ربوا کو ہی بیان کیا گیا ہے اور حدیث "لاتأخذوا الدینار بالدینارین ولا الدرهم بالدرهمین" بھی......ربوا کی کتاب اللہ کی تفسیر ہے اور تفسیر اضعافا کے تحت داخل ہے، حدیث بخاری کی رباحسی کی مفسر ہے "الذهب بالذهب مثلا بمثل" یعنی فضل ربوا ہے، پس اس حسی ربوا میں شارع نے لغوی معنی میں اور شرعی میں مغائرت پیدا نہیں فرمائی ہے پس حسی ربوا شرعی کی بھی وہی تعریف ہے جس کی عربی عبارت یہ ہے:

"الفضل الخالی عن العوض المشروط فی البیع" دوسرا ربا حکمی ہے کہ حساً تفاضل عوضین میں نہیں ہے لیکن شارع نے سداً لباب الربا صورت تماثل کو بھی ربوا حسی کے حکم میں قرار دیا ہے جبکہ معاوضہ یداً بید نہ ہو کیونکہ مادہ ربوا کا تاخیر و تاجیل ہے اور بغیر تاخیر کے فضل غیر متعامل ہے اسی معنی پر محمول ہے حدیث مسلم "لاربوا فیما کان یدا بیدا" فضل حسی کا دروازہ اسی ربا حکمی سے مفتوح ہے کہ تجارت حاضرہ میں "فضل حسی" عادۃ ناممکن ہے۔

اسی ربا حکمی کو شارع نے حدیث "نهی النبی صلی الله علیه وسلم عن بیع دینار" اور حدیث "الذهب بالورق ربا إلا هاء وهاء الحدیث فی الاشیاء الستة" میں بیان فرمایا ہے۔(۱)

اقتباسات طویل ہو گئے اس لئے ان کا خلاصہ ذہن نشین کر لیجئے:

- ربوا شرعی اصطلاحی قرض اور تجارت دونوں میں پایا جاتا ہے۔
- ربوا شرعی کو تجارت کی صرف چند شکلوں کے ساتھ خاص کرنا اسلام پر افتراء ہے۔

---

(۱) لغات القرآن -فصل الباء الموحدة- لفظ ربا ۳/ ۱۵- ط: ندوة المصنفین دهلی.

- اسلام کی نظر میں ''مہاجنی اور تجارتی سود'' دونوں حرام ہیں، صرف مہاجنی سود کو حرام قرار دینا اور تجارتی سود کو جائز قرار دینا شریعت سے ناواقفی کی دلیل ہے۔
- ہر وہ چیز جو ذمہ پر آجائے اس میں زیادتی ''مشروط'' یا ''معروف'' طریقہ پر لینا سود ہے، خواہ وہ بیع کی صورت میں ہو یا قرض کی یا سلم کی شکل میں۔
- اموال ربویہ میں تساوی (برابری) ضروری ہے، زیادتی کی صورت میں شرعی ربوا پایا جائیگا۔
- انشورنس اور بینکنگ میں شرعی ربوا پایا جاتا ہے۔
- زیادتی کی شرط کا لفظوں میں بیان کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ جو شرط معروف ہو وہ بھی مشروط کے حکم میں ہے۔
- شریعت میں حقیقت کا اعتبار ہوتا ہے ''تسمیہ'' (نام رکھ لینے) کا نہیں۔
- شریعت نے جن عقود و معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور ان میں حرام وحلال کا فیصلہ فرمادیا ہے، ان میں طرفین کی رضامندی سے کچھ فرق نہیں پڑتا، شریعت کے حکم کو پیش نظر رکھا جائے گا، طرفین کی رضامندی اس پر اثر انداز نہیں ہوگی۔

سوال نمبر۲- اگر سود مذکور شرعی اصطلاحی ربوا ہے تو کیا مصالح مذکورہ کے پیش نظر اس کے جوز کی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے؟ اگر نکل سکتی ہے تو کیا؟

جواب: مصالح مذکورہ کی بناء پر انشورنس (جو ربوا اور قمار دونوں پر مشتمل ہے) کی اجازت نہیں دی جاسکتی، امام ابواسحاق الشاطبی نے ''الاعتصام'' میں اس موضوع پر ایک مستقل باب لکھا ہے اس میں مفصل دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ''مصالح مرسلہ'' کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شریعت نے ہمیں کھلی چھٹی دے دی ہے کہ ''مصالح'' کو سامنے رکھ کر جس طرح چاہیں قوانین اسلام میں ترمیم کرتے رہیں بلکہ اس کے لیے تین اہم شرطیں ہیں:

اول: مصالح کے پیش نظر جو قانون بنایا جائے وہ شریعت کے مقاصد کے مطابق

ہو نہ کہ ان کے خلاف۔

دوم: جب وہ لوگوں کو سامنے پیش کیا جائے تو عام عقلیں اس کو قبول کریں۔

سوم: وہ کسی حقیقی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہو۔(۱)

اس کے علاوہ امام موصوف نے ''الموافقات'' میں مفاسد اور مصالح پر سیر حاصل بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ''مصالح وہی معتبر ہیں جو شریعت کی نگاہ میں مصالح ہوں اور شریعت جن کا اعتبار کرے صرف چند ظاہری فائدوں کو مصالح نہیں کہا جائیگا۔ مثلاً شریعت نے ''نکاح فاسد'' کو قابل قبول نہیں سمجھا، حالانکہ اس میں بعض مصالح نظر آتے ہیں جیسے نسب ثابت کا ہونا، میراث کا دیا جانا وغیرہ۔

بحث کے آخر میں فرمایا:

''وہی مصالح قابل اعتبار ہیں جو اسباب مشروعہ سے حاصل ہوں اسباب غیر مشروعہ سے حاصل ہونے والے مصالح شریعت کی نگاہ میں مصالح نہیں ہیں''۔(۲)

علاوہ ازیں یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ ایسے احکام جو قرآن وحدیث میں منصوص ہوں، وہاں مصالح ومفاسد کی بحث ہی پیدا نہیں ہوتی، ربوا اور قمار دونوں کی حرمت قرآن کریم سے ثابت ہے اس لیے کوئی مصلحت اس حرام کو حلال نہیں کرسکتی۔

سوال نمبر:۳–''زندگی کے بیمہ، املاک اور ذمہ داری کے بیمہ کے درمیان شرعاً کوئی فرق ہوگیا یا تینوں کا حکم ایک ہی ہوگا''۔

جواب: تینوں قسمیں ربوا اور قمار پر مشتمل ہیں اس لئے تینوں کا حکم ایک ہی ہے۔

---

(۱) الاعتصام للشاطبی–الباب الثامن –الفرق بین البدع والمصالح المرسلة والاستحسان– ۲/ ۱۱۱.

(۲) الموافقات – ۱/ ۲۴۳ –لم نطلع علی طبع جدید.

سوال نمبر:۴-''معاملہ کی یہ شرط کہ اگر بیمہ شدہ شخص یا شیٔ وقت معین سے پہلے تلف ہو جائے تو اتنی رقم ملے گی اور اس کے بعد تلف ہوئی تو اتنی، جبکہ تلف ہونے کے وقت کا تعین غیر ممکن ہے اس معاملہ کو قمار کی حدود میں تو داخل نہیں کر دیتی''؟

جواب: بلاشبہ قمار کے بارے میں علمائے شریعت نے جو قاعدہ لکھا ہے وہ یہ ہے ''تعلیق الملک علی الخطر والمال فی الجانبین'' اور بیمہ پر یہ قاعدہ بالکل صادق ہے، اس لیے اس پر قمار کا حکم لگایا جائے گا، اور قمار کی حرمت بنص قرآن ثابت ہے، قمار کی حرمت میں غرر اور خطر کی ساری صورتیں داخل ہیں، ابوبکر الجصاص الرازی آیت میسر کے ذیل میں لکھتے ہیں:

ولاخلاف بین اهل العلم فی تحریم القمار وان المخاطرة من القمار قال ابن عباس ان المخاطرة قمار وان اهل الجاهلیة کانوا یخاطرون علی المال والزوجةوقد کان ذلک مباحا إلی أن ورد تحریمه.(۱)

''قمار (جوے) کی حرمت میں کسی کا بھی اختلاف نہیں ہے، اسی طرح اس امر پر بھی کہ خطر کی ساری صورتیں قمار میں داخل ہیں، ابن عباس فرماتے ہیں کہ خطر قمار ہے اہل جاہلیت مال اور بیوی سب کو جوے کی بازی پر لگا دیا کرتے تھے اور شروع میں اس کی اباحت تھی یہاں تک کہ اس کی حرمت نازل ہوگئی''۔

غرر اور خطر میں انجام سے بے خبری ہوتی ہے ملک العلماء فرماتے ہیں:

والغرر مایکون مستور العاقبة (۲)

''غرر وہ ہے جس میں انجام سے بے خبری ہو''۔

حاصل یہ ہوا کہ مال کو بازی پر لگانا اور انجام سے بے خبر ہونا جوا ہے، اسی طرح وہ معاملہ جس میں دونوں طرف مال ہو اور انجام معلوم نہ ہو قمار کی حدود میں داخل ہے خواہ وہ خرید و فروخت کی شکل میں یا بیمہ کی شکل میں۔

---

(۱) احکام القرآن لأبی بکر الجصاص – باب تحریم المیسر – ۳۸۸/۱– ط: دار الکتب العلمیة بیروت.

(۲) بدائع الصنائع –۶۸/۳.

امام دارالہجرۃ مالک بن انس اسی قسم کے ایک معاملہ کی مثال دیتے ہیں:

أن يعمد الرجل إلى الرجل قد ضلت راحلته أو دابته أو غلامه وثمن هذه الأشياء خمسون دينار فيقول أن أخذها منک بعشرين ديناراً فإن وجدها المبتاع ذهب من مال البائع ثلاثين دينارا وإن لم يجد ماذهب البائع منه بعشرين ديناراً وهمالايدريان كيف يكون حالها فى ذلک ولايدريان ايضا إذا وجدت تلک الضالة كيف توخذ وماحدث فيها من امر الله ممايكون فيه نقصها وزيادتها فهذا اعظم المخاطرة.(۱)

''ایک شخص کسی دوسرے شخص کے پاس جائے جس کا اونٹ یا کوئی جانور یا غلام گم ہوگیا ہو اور ان کی قیمت مثلاً پچاس دینار ہو وہ جا کر اس سے کہے میں تم سے اس گم شدہ چیز کو بیس دینار میں خریدتا ہوں سو اگر خریدنے والے کو گم شدہ چیز مل جاتی ہے تو مالک کو تیس دینار کا نقصان ہوگا اور اگر نہیں ملتی تو اس کو بیس دینار مفت میں مل جائیں گے، ان دونوں کو معاملہ کرتے وقت کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہوگا وہ چیز ملتی ہے یا نہیں اور اگر ملتی بھی ہے تو کس حال میں اور یہ بھی معلوم نہیں کہ اس میں کیا زیادتی کمی ہو چکی ہے، یہ سب خطر میں داخل ہے۔

سوال نمبر:۵- اگر یہ قمار ہے یا غرر ہے تو کیا مصالح مذکورہ کے پیش نظر اسے نظر انداز کر کے اس معاملہ کے جوز کی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے اور اگر نکل سکتی ہے تو کیسے؟

سوال نمبر:۶- اگر بیمہ دار مندرجہ اقسام بیمہ میں سے کسی میں سود لینے سے بالکل محترز رہے اور اپنی اصل رقم کی صرف واپسی چاہتا ہو تو کیا معاملہ جائز ہو سکتا ہے؟

جواب: سود کے ساتھ ہی ساتھ بیمہ زندگی یا بیمہ املاک میں قمار کی جو صورت ہوتی ہے اس سے بھی احتراز

(۱) المدونة الكبرى -۳/ ۲۵۴.

کرے تو تو گنجائش نکل سکتی ہے لیکن ربو اور قمار کے کاروبار کی اعانت وامداد کی قباحت بدستور رہے گی۔

سوال نمبر:۷- جو رقم کمپنی بطور سود ادا کرتی ہے اسے ربوا کے بجائے اس کی جانب سے اعانت وامداد اور تبرع واحسان قرار دیا جائے۔

جواب: جب تک اس معاملہ کی حقیقت تبدیل نہ ہو صرف نام رکھ لینے یا سمجھ لینے سے مسئلہ شرعی میں فرق نہیں پڑتا۔

سوال نمبر:۸- اگر کوئی مسلمان کسی دار الحرب کا باشندہ ہو (مقامی نہیں) اور کمپنی بھی حربیوں ہی کی ہو تو کیا اس صورت میں یہ معاملہ مسلمانوں کے لیے جائز ہوگا؟

جواب: دار الحرب میں فقہاء نے عقود فاسدہ کی اجازت دی ہے، عام کتابوں میں اگرچہ مستامن کی قید ہے لیکن شرح السیر الکبیر سے حربی مسلم کے لیے بھی اجازت معلوم ہوتی ہے۔

ثم قد علم أن الربا لایجری بین المسلم والحربی فی دار الحرب(۱)

''پھر یہ امر معلوم ہے کہ ربوا دار الحرب اور اور دار الاسلام کے باشندوں کے درمیان جاری نہیں ہوتا''۔

اس کی دلیل بھی مؤلف کی زبانی سنیئے:

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کب اسلام لائے، بعض کی رائے یہ ہے کہ وہ غزوہ بدر سے قبل ہی اسلام لا چکے تھے، بعض کہتے ہیں کہ غزوہ بدر میں گرفتار کر لیے گئے اور اس کے بعد اسلام لائے، پھر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ''مکہ'' واپس جانے کی اجازت چاہی، آپ نے اجازت مرحمت فرمادی، مکہ میں سکونت پذیر رہے اور وہاں سودی کاروبار فتح مکہ تک

(۱) شرح السیر الکبیر -۳/ ۱۱۲.

کرتے رہے، حالانکہ سود کی حرمت اس سے قبل آچکی تھی، چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو صحابہ سے غزوۂ خیبر میں فرمایا کہ تم نے اگر سود لیا ہو تو واپس کردو، علاوہ ازیں لاتأکلوا الربوا اضعافا مضاعفة (سود نہ کھاؤ دو چند، سہ چند) آیت کریمہ غزوۂ احد کے زمانہ میں اتری تھی اور مکہ اس کے کئی سال بعد فتح ہوا، فتح مکہ کے زمانہ میں آپ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے پچھلے سارے معاملات کو باطل قرار نہیں دیا سوائے ان معاملات کے جن میں ابھی تک قبضہ نہیں ہوا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ حربی اور مسلم کے درمیان سودی معاملہ ہوسکتا ہے"۔(۱)

ایک اور جزئیہ قابل ملاحظہ ہے:

ولو كان المسلم في منعة المسلمين فكلم الحربي من حصنه وعامله بهذه المعاملات الفاسدة فيما بين المسلمين فإن ذلك لايجوز وقد بينا ان كثيرا من مشايخنا يقولون بالجواز ههنا لأن مال الحربي مباح في حق المسلم .(۲)

اگر کوئی مسلمان اہل اسلام کے لشکر میں ہو، حربی نے اپنے قلعہ سے مسلمان سے گفتگو کی اور معاملات فاسدہ میں سے کوئی معاملہ کرلیا تو یہ امام محمد کے نزدیک جائز نہیں، البتہ پہلے بتلا چکے ہیں کہ ہمارے اکثر مشائخ اس مسئلہ میں بھی جواز کے قائل ہیں، کیونکہ حربی کا مال مسلمان کے حق میں (جبکہ اس میں دھوکہ فریب نہ ہو) مباح ہے۔

دارالحرب سے دارالاسلام کی اگر صلح ہوجائے تب بھی اس قسم کی معاملات کی اجازت ہے۔

دارالحرب والوں نے دارالاسلام والوں سے اگر صلح کررکھی ہو اس زمانہ میں دارالاسلام کا باشندہ ان کے یہاں گیا اور ایک درہم کو دو کے عوض بیچ دیا تو اس میں حرج نہیں ہے کیونکہ اس صلح سے دارالحرب دارالاسلام نہیں بن جاتا مسلمانوں کے لیے

(۱) شرح السير الكبير -۳/۱۱۲ .

(۲)المرجع السابق.

دارالحرب والوں کا مال ان کی خوشی اور رضامندی کے بغیر لینا حرام ہے کیونکہ اس میں غدر (دھوکہ فریب) پایا جاتا ہے لیکن جب انہوں نے خوشی اور رضامندی سے یہ معاملہ کیا ہے تو دھوکہ وفریب کے معنی معدوم ہوگئے اور ان سے لیا ہوا مال مباح ہوگیا۔(۱)

دارالحرب میں عقود فاسدہ کے جواز کا مسئلہ صرف امام ابوحنیفہ کے نزدیک ہی نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے بلکہ امام مالک بھی اس کے جواز کے قائل ہیں البتہ امام موصوف کے نزدیک ایک شرط ہے وہ یہ کہ دارالاسلام سے دارالحرب کی صلح نہ ہو۔

سئل الإمام مالک هل بين المسلم إذا دخل دار الحرب وبين الحربي ربوا ؟فقال الإمام هل بينكم وبينهم هدنة؟ قالوا لا فقال مالک فلابأس في ذلک.(۲)

''امام مالک رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ مسلم اگر دارالحرب میں داخل ہوتو وہاں کے لوگوں سے سود لے سکتا ہے؟ امام مالک نے دریافت کیا کہ کیا تم میں اور ان میں صلح ہے؟ کہا گیا نہیں تو آپ نے فرمایا کوئی حرج نہیں''۔

علامہ شامی کے فتوی میں بھی حربیوں سے اس قسم کے معاملات کی اجازت آپ پڑھ چکے ہیں لیکن یہ واضح رہے کہ ربوا اور قمار بنص قرآن کریم حرام ہیں اور ان دونوں پر سخت وعیدیں آئیں ہیں اس لیے اس قسم کے معاملات سے احتراز کرنا ضروری ہے، انتہائی ضرورت ومجبوری کی حالت میں اس طرح کی گنجائش سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، اس موقعہ پر ایک غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے لہذا اس کے ازالہ کے لیے ہم مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی عبارت نقل کردینا کافی سمجھتے ہیں۔

اسی مسئلہ کی بنیاد پر ایک اور معاشی سوال پیدا ہوگیا یعنی غیر اسلامی حکومت کسی غیر مسلم باشندہ کا روپیہ کسی ایسے ذریعہ سے جو اسلامی قانون کی رو سے لین دین کا قانون اور

(۱) شرح السیر الکبیر -۲۲۸/۳۔

(۲) المدونۃ الکبری - ۱۸۱۔

شرعی ذریعہ نہیں ہے مثلاً ربو یا قمار یا ازیں قبیل کے کسی اور غیر شرعی ذریعہ سے کسی مسلمان کے قبضہ میں آ جائے تو کیا قانوناً یہ مسلمان اس کا مالک ہوسکتا ہے یا نہیں؟ چونکہ یہ ایک جائز اور مباح مال پر قبضہ ہے اور مباح وجائز مال کے مملوک ہونے کے لیے صرف قبضہ کافی ہے مثلاً جنگل کے کسی پرندے کا شکار کر کے قبضہ کر لینا اس پرندے کے مالک ہونے کے لیے کافی ہے، اسی لیے امام ابوحنیفہ کی رائے ہے کہ اس قسم کے اموال کا مسلمان قانون طور پر مالک بن جاتا ہے اور یہی ان کا مشہور نقطہ نظر ہے جس کی وجہ سے حنفی فقہ کی عام کتابوں میں لا ربوا بین الحربی والمسلم (غیر اسلامی حکومت کے باشندہ اور اسلامی حکومت کے باشندہ کے درمیان ربو (سود) نہیں ہے) کا ذکر پایا جاتا ہے گویا یہ بین الاقوامی قانون کی ایک دفعہ ہے، عوام چونکہ اس کے اصل منشا سے واقف نہیں ہیں اس لیے ان کو حیرت ہوتی ہے کہ ربوا (سود) جب اسلام میں حرام ہے تو ہر جگہ اور ہر شخص سے لینا حرام ہونا چاہیے، حربی یعنی غیر اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ اس کے جائز ہونے کے کیا معنی؟ مگر سچی بات یہ ہے کہ حربی کے ساتھ یہ معاملہ ربوا کا معاملہ ہی نہیں ہے، بلکہ ایک مباح مال کو قبضہ میں لے کر اسے ملک بنانا ہے اسی طرح یہ مسئلہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ شرعی غلام اور آقا کے درمیان بھی اگر ربوا کا معاملہ کیا جائے تو وہ بھی ربوا نہ ہوگا، ظاہراً اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ باوجود ربو اور سود ہونے کے امام نے اس کو حرمت سے مستثنیٰ کیا ہے، بھلا ایک مجتہد کو اس کا حق کیا ہے؟ بلکہ بات یہ ہے کہ قانوناً غلام کا مال آقا ہی کا مال ہے...... الخ(۱)

سوال نمبر: ۹- اگر یہ کاروبار حکومت کے ہاتھ میں ہو تو کیا اس بناء پر کہ خزانہ حکومت میں رعیت کا ہر فرد کا حق ہوتا، زیر بحث معاملہ میں سود کی رقم عطیہ حکومت قرار پا کر ربوا کے حدود سے خارج ہوسکتی ہے۔

(۱) اسلامی معاشیات-ص: ۴۰۸.

جواب: اگر ہم یہ تسلیم بھی کرلیں کہ خزانہ حکومت میں رعیت کے ہر فرد کا حق ہوتا ہے تب بھی سود کی رقم ربوا کے حدود سے خارج نہیں ہوتی، کیونکہ حق ملک اور ملک میں بنیادی فرق ہے، حق ملک کو ملک قرار نہیں دیا جاسکتا، ملک کی صورت میں ربوا نہیں ہوتا، مثلاً شرعی غلام اور آقا اگر کوئی سودی معاملہ کریں تو اس کو سود نہیں کہا جائیگا کیونکہ ملک غلام اور آقا کی واحد ہے، اسی طرح اگر ایک شخص اپنی آمدنی کو مختلف مدوں میں تقسیم کر کے الگ الگ رکھ لے پھر ایک مد کے لیے دوسرے مد سے قرض لے اور اس میں کچھ رقم بطور سود لگا لے تو وہ سود نہیں کہلائے گا، علاوہ ازیں جن دو شخصوں کے درمیان شرکت کا معاملہ ہو اور وہ اس مال مشترک میں آپس میں کوئی سودی معاملہ کرلیں تو وہ بھی سود نہیں ہوگا، شرکت کی وجہ سے دونوں کی ملک ایک سمجھی جائے گی۔

حق ملک کی صورت میں سود ہوگا مثلاً میاں بیوی جبکہ دونوں کی املاک علیحدہ ہوں، اگر آپس میں کوئی سودی لین دین کریں تو حرام اور ناجائز متصور ہوگا، حالانکہ بیوی کو اپنے شوہر کے مال میں بقدر نفقہ حق ملک ہوتا ہے، علی ہذا القیاس باپ اور بیٹا اگر آپس میں ربوا کا معاملہ تو اس پر حرام ہونے کا حکم لگایا جائے گا، اور یہ کہنا کہ بیٹے کے مال میں باپ کا حق ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے **انت ومالک لأبیک** اس معاملہ کو ربوا کے حکم سے خارج نہیں کرسکتا۔

ملک العلماء ربوا جاری ہونے کی شرائط کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

ومنها أن لایکون البدلان ملکا لأحد المتبایعین فانه لایجری الربا، وعلی هذا یخرج العبد الماذون إذا باع مولاه درهما بدرهمین ولیس علیه دین انه یجوز لانه إذا لم یکن علیه دین فما فی یده لمولاه فکان البدلان ملک المولی فلایکون هذا بیعا فلایتحقق الربا إذ هو مختص بالبیاعات وکذلک المتفاوضان إذا تبایعا درهما بدرهمین یجوز لأن البدل من کل واحد منهما مشترک بینهما فکان مبادلة ماله بماله فلایکون بیعا ولا مبادلة حقیقة .(۱)

---

(۱) بدائع الصنائع– کتاب البیوع– شرائط جریان الربوا– ۴/۲۱۷– ط: دار احیاء التراث العربی.

بدلین اگر معاملہ کرنے والوں کے ملک نہ ہوتو سود جاری نہیں ہوگا مثلاً عبد ماذون اگر اپنے آقا کو ایک درہم کے عوض میں دو درہم بیچ دے اور غلام پر کسی کا دین نہ ہوتو یہ معاملہ جائز ہے کیونکہ دین نہ ہونے کی صورت میں غلام کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کے آقا کی ملک ہے لہٰذا بدلین آقا کی ملک ہیں اس لیے یہ بیع ہی نہیں ہوئی لہٰذا ربو بھی نہیں ہوگا کیونکہ ربو بیع کے ساتھ خاص ہے، اسی طرح دو شریک جب اس طرح کا معاملہ کریں تو وہ بھی جائز ہے کیونکہ بدل مشترک ہے اسلیے یہاں حقیقۃ بیع ہی نہیں ہوئی۔

حقیقت ملک اور حق ملک کا فرق ایک اور مسئلہ سے بھی واضح ہوگا، مسئلہ یہ ہے کہ بائع (فروخت کرنے والا) جب خریدنے والے سے کہے کہ میں نے تیرے ہاتھ یہ مال فروخت کردیا اس کو ''ایجاب'' کہا جاتا ہے ایجاب کے بعد خریدنے والے کو حق ہوتا ہے کہ وہ اس معاملہ کو قبول کرے یا نہ کرے بائع کے ایجاب کے بعد خریدنے والے کو قبول کرنے کا حق معاملہ کی مجلس تک باقی رہتا ہے، لیکن اگر بائع ایجاب کرنے کے بعد جبکہ مشتری نے قبول نہ کیا ہوا پنے ایجاب سے رجوع کرلے تو وہ رجوع کرسکتا ہے، اس صورت میں مشتری کا حق قبول سوخت ہوجائیگا۔ اس پر اعتراض ہوسکتا ہے کہ مشتری کو جب مجلس کے اختتام تک حق قبول حاصل ہے تو بائع کو ایجاب سے رجوع نہیں کرنا چاہیے، اس اعتراض کا جواب صاحب عنایہ اس طرح دیتے ہیں کہ مشتری کو تو حق ملک حاصل ہے لیکن بائع کو حقیقت ملک حاصل ہے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے حقیقت ملک اعلیٰ ہے اور حق ملک ادنی، لہٰذا اعلیٰ ادنی کو سوخت کردے گا چنانچہ فرماتے ہیں:

فالجواب أن الایجاب إذا لم یکن مفیدا للحکم وھو الملک کان الملک حقیقة للبائع وحق التملک للمشتری ان سلم ثبوته بایجاب البائع لایمنع الحقیقة لکونھا أقوی من الحق لامحالة.(۱)

اس کا جواب یہ ہے کہ محض ایجاب سے جبکہ حکم یعنی ملک حاصل نہیں ہوتی تو ملک حقیقت کے لحاظ سے بائع کی ہے اور حق ملک مشتری کا حق ملک ملک کو منع نہیں کرسکتا کیونکہ وہ حق سے قوی تر ہے''۔

---

(۱) العنایة علی فتح القدیر - کتاب البیوع - تحت قوله : وإذ أوجب أحد المتعاقدین -۵/۴۶۰.

سوال نمبر: ۱۱- فرض کیجئے بیمہ کا کاروبار حکومت کے ہاتھ میں ہے، ایک شخص بیمہ پالیسی خریدتا ہے اور میعاد میں اصل مع سود کے وصول کرتا ہے لیکن سود کی رقم بصورت ٹیکس یا چندہ خود حکومت کو دے دیتا ہے۔

جواب: سود لینا حرام ہے، اس لیے اس کو لیکر پھر واپس کر دینا اس حرام کو حلال نہیں کرسکتا۔

سوال نمبر: ۱۲- بیمہ دار اگر سود کی رقم بغیر نیت ثواب کسی دوسرے شخص کو امداد کے طور پر دے دیتا ہے تو اس صورت میں انشورنس کا معاملہ کیا جائز ہوگا؟

جواب: اس صورت میں بھی انشورنس کے کاروبار کی اجازت نہیں ہے، الّا یہ کہ ناواقفیت کی بناء پر اگر انشورنس کا معاملہ کرلے اور اس سے رقم سود وصول ہوجائے تو یہی طریقہ ہے کہ کسی شخص کو بلانیت ثواب امداد کے طور پر دے دے۔

سوال نمبر: ۱۳- اگر انشورنس کے جواز کی گنجائش نہیں ہے تو کیا مصالح وحاجات مذکورہ کو سامنے رکھ کر اس کا کوئی بدل ہوسکتا ہے جس میں مصالح مذکورہ موجود ہوں اور اس پر عمل کرنے سے ارتکاب معصیت لازم نہ آئے اگر ہوسکتا ہے تو کیا انشورنس کی مروجہ شکل میں کیا کوئی ایسی ترمیم ہوسکتی ہے جو اسے معصیت سے خارج کردے اور مصالح مذکورہ کو فوت نہ کرے، اگر ہوسکتی ہے تو کیا ہے؟

جواب: الف: اس کا بدل پچھلے صفحات میں ہم بتلا چکے ہیں۔

ب: جب تک ربوا اور قمار موجود ہیں معصیت کے دائرہ سے خارج ہونا مشکل ہے۔

بیمہ مروجہ میں دو صورتیں جائز ہیں:

۱- ڈاک خانہ کا بیمہ: یہ جائز ہے کیونکہ ودیعۃ باجر میں داخل ہے جس طرح منی آرڈر کی فیس دینا

جائز ہے۔

۲- جہازران کمپنی اگر بیمہ بھی کرے اور مال کی ضمانت بھی دے دے تو مال تلف ہونے کی صورت میں اس کو ضامن بنایا جاسکتا ہے اور نقصان کا معاوضہ لیا جاسکتا ہے، جبکہ تاجر نے اس کمپنی کے جہاز میں اپنا مال بھیجا ہو۔

کتبہ ولی حسن ٹونکی

بینات۔ ذوالقعدۃ وذوالحجہ ۱۳۸۴ھ